الرسالہ

Al-Risāla

April 2005 • No. 341 • Rs. 10

پیچھے کی طرف دیکھنا مایوسی اور شکایت کا ذہن بناتا ہے اور آگے کی طرف دیکھنا امید اور حوصلہ کا ذہن پیدا کرتا ہے۔

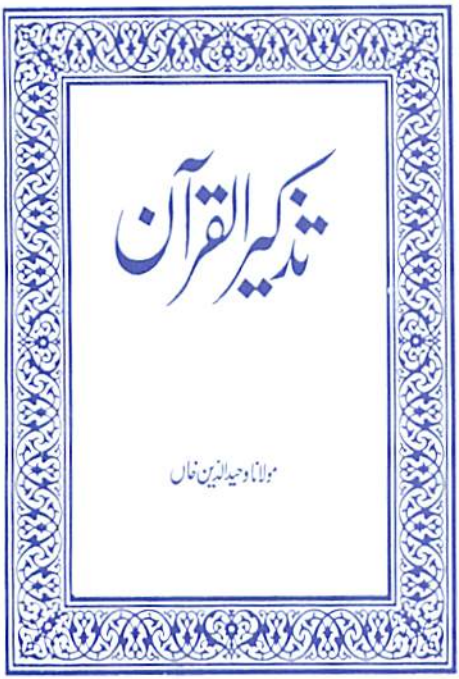

تذکیر القرآن

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ: ۴۰۰ روپے (ہارڈ باؤنڈ)

۲۵۰ روپے (پیپر بیک)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

اپریل 2005

فہرست

حج کے منافع	2
امن کا مسئلہ	4
مادی ترقی کا سراب	6
اخلاقی ماڈل	8
دعوت کا عمل	13
دار الاسلام، دار الکفر، دار الحرب	23
نکاح اور طلاق	36
ایک خط	40
خبر نامہ اسلامی مرکز 168	45

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-13
Tel. 2435 6666, 2435 5454
Fax: 2435 7333
email: info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $20 (Air Mail)

Distributed In England by
IPCI: Islamic Vision
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info @ ipci-iv.co.uk

Distributed in the USA by
Al-Risala Forum International
2665 Byberry Rd.
Bensalem, PA 19020 (USA)
Tel/fax: 215-639-3584
e-mail:caleem@juno.com

Printed and published
by Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

New Release!

حج کے منافع

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، وہ تمہارے پاس آئیں گے۔ پیروں پر چل کر اور دبلے اونٹوں پر سوار ہو کر جو کہ دور دراز راستوں سے آئیں گے تاکہ وہ اپنے منافع کی جگہوں پر پہنچیں اور چند معلوم دنوں میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں (الحج ۲۷۔۲۸)

یہاں منافع سے مراد ایمانی منافع ہیں۔ حج کے موقع پر ان ایمانی منافع کا ذریعہ وہ چیز ہے جس کو قرآن میں دوسرے مقام پر شعائر اللہ (البقرہ ۱۵۸) کہا گیا ہے، یعنی اللہ کی یادگاریں۔ اللہ کی یادگاروں سے مراد تحریک توحید کی وہ تاریخی یادگاریں ہیں جو پیغمبروں کے ذریعہ اس علاقہ میں قائم ہوئیں۔ حج کے موقع پر جو مراسم ادا کئے جاتے ہیں وہ سب اسی پیغمبرانہ تاریخ کی یاددہانی کے لیے ہیں۔

احرام کا مطلب یہ ہے کہ مادی کلچر سے نکل کر آدمی ربانی کلچر میں داخل ہو گیا۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کر کے حاجی اس عہد کی تجدید کرتا ہے کہ وہ اسماعیل اور ام اسماعیل کی طرح اپنے آپ کو دین توحید کے لیے وقف کرے گا۔ جمرات پر کنکریاں مار کر وہ علامتی زبان میں یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں اسی طرح شیطان کو اپنے آپ سے دور بھگاؤں گا جس طرح پیغمبر نے شیطان کو اپنے آپ سے دور بھگایا۔ قربانی کر کے حاجی یہ عہد کرتا ہے کہ وہ مادہ پرستی کو چھوڑ کر خدا پرستی کی زندگی اختیار کرے گا۔ عرفات کے میدان میں اکٹھا ہو کر تمام حاجی اس وقت کو یاد کرتے ہیں جب وہ میدان حشر میں اپنا حساب دینے کے لیے حاضر کئے جائیں گے۔

آخر میں حاجی پیغمبر کی اس پکار کو لے کر واپس ہوتا ہے جو اب بھی عرفات کی فضاؤں میں گونج رہی ہے۔ پیغمبر اسلام نے یہاں ۱۴۰۰ سال پہلے فرمایا تھا: ان اللہ بعثنی کافة للناس فادّوا عنی (اللہ نے مجھ کو تمام لوگوں کے لئے بھیجا ہے اس لیے تم میری طرف سے تمام انسانوں تک میرا پیغام پہنچا دو) حج کا سبق یہ ہے کہ اے مسلمانو، تم لوگ خدا کے دین کی عالمی پیغام رسانی میں سرگرم

ہو جاؤ۔ تمہاری دوڑ دھوپ، تمہارا ٹھہرنا اور چلنا، تمہارا چپ ہونا اور بولنا سب کچھ اسی دعوتی مشن کے لیے وقف ہو جائے۔

حج کو افضل عبادت کہا گیا ہے۔ یہ کوئی پُر اسرار بات نہیں۔ بلکہ یہ ایک معلوم حقیقت ہے۔ حج کی سالانہ عبادت کے دوران جو عمل کئے جاتے ہیں اُن پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حج اپنے کثیر فوائد کی بنا پر اس قابل ہے کہ اس کو افضل عبادت کہا جائے۔

حج میں ساری دنیا کے مسلمان مختلف علاقوں سے چل کر کعبہ کی سرزمین میں پہنچتے ہیں۔ یہ سفر پتھروں کا سفر نہیں ہوتا بلکہ وہ زندہ انسانوں کا سفر ہوتا ہے، ایسے انسان جو دیکھنے اور سننے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس طرح جب یہ لوگ حج کے موسم میں دنیا کے مختلف علاقوں سے نکل کر حجاز کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک عالمی ہلچل وجود میں آجاتی ہے۔ اس اعتبار سے حج کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ عالمی سطح پر انسانوں کا ایک عبادتی موبلائزیشن ہے۔

تقریباً نصف کروڑ کی تعداد میں جب اہل ایمان اپنے گھروں سے نکل کر حج کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو اس دوران بار بار ان کا انٹریکشن دوسروں سے ہوتا ہے۔ اس انٹریکشن کے دوران اپنے آپ یہ ہوتا ہے کہ مختلف ملکوں کے لوگوں کے درمیان اسلام کے تعارف کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ حاجی کو اس سفر کے دوران نئی نئی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس سے اُس کے تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس دوران اُس کی زندگی مختلف مراحل سے گذرتی ہے۔ اس طرح حج کا سفر اس کے لیے دینی سیاحت کے ہم معنٰی بن جاتا ہے۔ اس سفر کے دوران بار بار دوسرے حاجیوں سے اس کے اختلافات ہوتے ہیں۔ مگر لا جدال فی الحج کے حکم ربانی کے تحت وہ ان اختلافات پر تحمل کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس طرح حج اس کے لیے اختلاف کے باوجود اتحاد کی تربیت بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حج ایک جامع عبادت ہے۔ حج کا عمل ایک ایسی تربیت ہے جس میں وہ تمام پہلو شامل ہو جاتے ہیں جو اسلام میں ہر فرد سے مطلوب ہیں۔ تاہم حج کے فائدے صرف اس انسان کو ملتے ہیں جو زندہ شعور کے ساتھ حج کی عبادت کرے۔

امن کا مسئلہ

جامعہ ہمدرد (نئی دہلی) میں ۲۱ دسمبر ۲۰۰۴ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کا ایک اجتماع تھا۔ یہ اجتماع جامعہ ہمدرد کے بورڈ روم میں کیا گیا تھا۔ پروگرام کے مطابق، امریکا کے ایک سینئر پروفیسر تھیوڈور رائٹ (Theodore P. Wright) نے اپنا ایک مقالہ پیش کیا۔ اس مقالہ کا عنوان یہ تھا۔

US intervention in South Asia & the Middle East.

پروفیسر رائٹ کی عمر ۸۰ سال ہو چکی ہے۔ وہ نیویارک اسٹیٹ یونیورسٹی میں پولیٹکل سائنس کے پروفیسر تھے۔ وہ ساؤتھ ایشیا کے علاقہ میں بسنے والے مسلمانوں کے مسائل پر امریکی اکسپرٹ سمجھے جاتے ہیں۔ وہ اس میدان میں پچھلے ۴۰ سال سے کام کر رہے ہیں۔ پروفیسر موصوف کی خواہش پر راقم الحروف نے اس پروگرام میں شرکت کی۔

اس موقع پر ایک سوال یہ سامنے آیا کہ ساؤتھ ایشیا میں امن کس طرح قائم کیا جائے (How to establish peace in South Asia)۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس علاقہ کے لوگ اپنی جدوجہد کو اسلامی جہاد کے نام پر جاری کئے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی یہ جدوجہد اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے ایک آیت اور ایک حدیث پیش کی۔ میں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: الصلح خیر (النساء ۱۲۸) یعنی صلح اور سمجھوتہ کا طریقہ زیادہ مفید اور زیادہ نتیجہ خیز ہے۔ صحیح البخاری کی ایک روایت کو پیش کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام کی پالیسی یہ تھی کہ نزاعی معاملات میں اختیار اعسر (harder option) کے مقابلہ میں اختیار ایسر (easier option) کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ آزادی کا زمانہ ہے۔ موجودہ حالات میں پرامن طریق کار کا راستہ پوری طرح کھلا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے معاملات میں پرتشدد

طریق کار اختیار کریں۔ اس پر ایک مسلم پروفیسر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

It is too simplistic solution to a very complex problem.

اس کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ مسئلہ کے سادہ حل کی بات نہیں ہے بلکہ وہ مسئلہ کے فطری حل کی بات ہے۔ اس دنیا میں فطرت کا جو نظام ہے اس کے مطابق متشددانہ طریق کار کسی بھی مسئلہ کا حل نہیں۔ اس دنیا میں کسی بھی مسئلہ کے حل کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ امن کا طریقہ ہے۔ تشدد کا طریقہ صرف مسئلہ کو مزید پیچیدہ بناتا ہے۔ نصف صدی سے زیادہ مدت کی پچھلی تاریخ اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اس پوری مدت میں مسلمانوں نے تشدد کا طریقہ اختیار کیا اور اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ مگر مسئلہ اور زیادہ بگڑتا چلا گیا۔

پھر میں نے کہا کہ اس قرآنی فارمولا کی افادیت ہر آدمی خود اپنی زندگی میں پا سکتا ہے۔ ہر آدمی کی زندگی میں بار بار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ہر آدمی جو اپنی ذاتی زندگی میں کامیاب دکھائی دیتا ہے وہ امن اور سمجھوتہ ہی کے راستہ پر چل کر کامیاب ہوا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ لوگ اپنے ذاتی معاملہ میں تو صلح اور سمجھوتہ کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں اور جب ملّی مسائل کی بات آتی ہے تو فوراً وہ متشددانہ طریق کار کی وکالت کرنے لگتے ہیں۔ لوگوں کی یہ دوعملی (duplicity) بلاشبہہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کا یہ عجیب تضاد ہے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ عراق میں امریکی صدر جارج بش کا متشددانہ عمل درست تھا یا نہیں تو وہ فوراً کہیں گے کہ وہ درست نہ تھا۔ جارج بش کو ہر حال میں پر امن طریقہ پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ مگر انہی مسلم دانشوروں سے جب یہ سوال کیا جائے کہ فلسطین میں عربوں کا متشددانہ طریقہ درست ہے یا نہیں تو وہ برعکس طور پر یہ جواب دیں گے کہ وہ بالکل درست ہے۔ ان مسلم دانشوروں کا یہ عجیب تضاد ہے کہ دوسری قوم کے لوگ اگر تشدد کا طریقہ اختیار کریں تو وہ ان کے نزدیک غلط ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان کی اپنی قوم کے لوگ تشدد کا طریقہ اختیار کریں تو وہ ان کے نزدیک عین درست بن جاتا ہے۔ اس فکری تضاد میں مذہبی مسلمان اور سیکولر مسلمان دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔

مادّی ترقی کا سراب

موجودہ دنیا میں مادی ناکامی بھی اُتنی ہی بے معنیٰ ہے جتنا کہ مادی کامیابی۔ اس کی مثالیں برابر مختلف صورتوں میں سامنے آتی رہتی ہیں۔ مثلاً بمبئی میں ۲۹ جولائی ۲۰۰۴ کو یہ واقعہ ہوا کہ ۲۵ سالہ مس انڈیا نفیسہ جوزف نے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔ حالاں کہ اس وقت وہ نہایت کامیاب ماڈل بنی ہوئی تھیں۔ اُن کا یہ قول خود اُن کے اوپر صادق آیا کہ مشہور ہونا گویا پانی کے بلبلہ میں رہنا ہے جو کسی بھی لمحہ ٹوٹ سکتا ہے:

Being famous is like living in a bubble that can burst any moment.

اسی بمبئی سے ایک اور زیادہ اہم خبر آئی ہے جو انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) کے شمارہ ۲۲ اگست ۲۰۰۴ میں چھپی ہے۔ یہ مشہور صنعت کار جگی لال کملاپت سنگھانیہ کے پوتے گوتم سنگھانیہ کا انٹرویو ہے جو مذکورہ اخبار کے ضمیمہ (Times Life) کے صفحہ اول پر نمایاں طور پر چھپا ہے۔

مسٹر گوتم سنگھانیہ ہندستان کے بڑے صنعت کاروں میں سے ایک ہیں۔ مگر دولت نے اُنہیں خوشی نہیں دی۔ دولت کے انبار میں رہتے ہوئے وہ مکمل طور پر بے سکونی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بمبئی میں اپنی بظاہر آرام دہ رہائش گاہ میں بیٹھ کر اُنہوں نے ٹائمس آف انڈیا کے نیوز نیٹ ورک سے ملاقات میں یہ باتیں کہیں۔

گوتم سنگھانیہ بظاہر تمام مادی چیزوں کے مالک ہیں — ایک ہزار کروڑ کی ایمپائر کا ورثہ، کئی ہوائی جہاز، کاریں، تفریحی کشتی، وغیرہ (مگر ان سب کے باوجود گوتم سنگھانیہ کو ۳۱ سال کی عمر میں بھی خوشی حاصل نہیں)۔ میں دنیا کے دس ایسے آدمیوں کے نام لے سکتا ہوں جو اتھاہ دولت کے مالک ہیں مگر وہ انتہائی غمگین زندگی گذار رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت، شہرت، اقتدار، یہ چیزیں آپ کو خوشی نہیں دے سکتیں:

The son of Vijaypat Singhania had it all, a thousand crore empire to inherit, planes, cars, yachts. I can name 10 people who have all the

money in the world, but are miserable. So, money, fame, power—these things can't make you happy.

اصل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے ذہن میں ایک پُرمسرت دنیا (جنت) کا حسین تصور پیدائشی طور پر لیے ہوئے ہے۔ وہ اپنی ساری طاقت استعمال کر کے دولت کماتا ہے تاکہ وہ اپنے تخیل کے مطابق، یہ حسین دنیا بنا سکے۔ مگر مادی اعتبار سے جب وہ سب کچھ حاصل کر چکا ہوتا ہے تو اُس پر منکشف ہوتا ہے کہ اُس کی بنائی ہوئی جنت میں اُس کو حقیقی سکون حاصل نہیں۔

یہ کم وبیش ہر انسان کا حال ہے۔ ہر انسان خود اپنے بنائے ہوئے خوبصورت مادی قبرستان میں دفن ہو رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی مطلوب دنیا لامحدود راحتوں کی دنیا ہے۔ ایسی دنیا موجودہ محدود عالم میں بن نہیں سکتی۔ وہ صرف موت کے بعد آنے والی دنیا میں بن سکتی ہے۔ یہ اگلی دنیا لامحدود بھی ہے اور ابدی بھی۔ اسی کے ساتھ یہ ہوگا کہ انسان جب اگلی دنیا میں پہنچے گا تو اس کو ایک نیا وجود دیا جائے گا جو ہر قسم کی کمیوں سے پاک ہوگا۔ قرآن کے الفاظ میں، لوگوں کو چاہیے کہ وہ اسی دنیا کے حصول کی تیاری کریں—لمثل هذا فليعمل العاملون (الصافات ٦١)

موجودہ دنیا میں اگر کوئی شخص اپنے لیے کامیاب زندگی کا نقشہ بنانا چاہتا ہے تو اس کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ اس معاملہ میں خدا کا تخلیقی نقشہ کیا ہے۔ اس دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر خدا کے تخلیقی نقشہ کی موافقت کر کے ہو سکتی ہے۔ خدا کے تخلیقی نقشہ کو نظر انداز کر کے کوئی شخص یہاں اپنے لیے کامیاب زندگی نہیں بنا سکتا۔

خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، موت سے پہلے کی عارضی دنیا صرف امتحان کے لیے ہے۔ اس نقشہ کے مطابق، مطلوب زندگی کی تعمیر صرف موت کے بعد کی زندگی میں ممکن ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کوشش کرے کہ وہ موت سے پہلے کے امتحان میں اپنے آپ کو کامیاب بنائے تاکہ وہ موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں خدائی انعام کے طور پر اپنی مطلوب دنیا حاصل کر سکے۔ کامیاب زندگی کی تعمیر کا یہی واحد اصول ہے۔

اخلاقی ماڈل

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعثت لاتمم حسن الأخلاق (مؤطا امام مالک، حسن الخلق، مسند احمد ۲/۳۸۱) یعنی میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کروں۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔

اخلاق سے مراد کسی انسان کا وہ سلوک ہے جو وہ دوسروں کے ساتھ کرتا ہے۔ جب بھی کسی انسان کا سابقہ دوسرے انسان سے پڑتا ہے، خواہ وہ خاندان کے اندر ہو یا خاندانی زندگی کے باہر، تو وہ اپنے قول وعمل سے کسی ایک یا دوسری صورت میں اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ اسی اجتماعی سلوک کا نام اخلاق ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بلند کرداری کا ثبوت دے۔ کوئی غصہ دلائے تو وہ اس کو معاف کردے۔ کوئی کڑوا بول بولے تو وہ میٹھے بول کے ساتھ اس کا جواب دے۔ کسی سے شکایت ہو جائے تو وہ اس کے بارے میں وہی کہے جو حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہو۔ وہ کسی کی بڑائی پر حسد نہ کرے۔ وہ کسی کے مال کا لالچ نہ کرے۔ وہ کسی کی برائی بیان نہ کرے۔ اُس کا سلوک ہمیشہ منصفانہ سلوک ہو۔ جب وہ وعدہ کرے تو اُس کو پورا کرے۔ جب اُس کو کوئی امانت دی جائے تو وہ اس امانت کو ٹھیک ٹھیک لوٹائے۔ اُس کو کسی سے اختلاف ہو جائے تو وہ ایسا نہ کرے کہ وہ اُس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے لگے۔ وہ فخر اور گھمنڈ کے مظاہرے سے اپنے آپ کو بچائے۔ وہ ہر سچائی کا کھلا اعتراف کرے، وغیرہ۔

اسی قسم کی روش کا نام اخلاق ہے۔ ہر پیغمبر نے ہر زمانہ میں انہی اخلاقی اصولوں کی تعلیم دی ہے۔ خدا کی شریعت میں، توحید کے بعد جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہی اخلاق ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقیات کی تکمیل کرنے کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب زندگی کے ہر

شعبہ میں حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرنا ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں ہر قسم کے واقعات پیش آئے۔ اس طرح آپ کو موقع ملا کہ آپ ہر معاملہ میں اخلاقی اصولوں کا عملی مظاہرہ کریں۔ اس طرح پیغمبر اسلام اخلاق کا ایک جامع ماڈل بن گئے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن خیارکم احاسنکم اخلاقا (البخاری، کتاب الأدب، مسلم، کتاب الفضائل، الترمذی، کتاب البر، مسند احمد ۲/۱۶۱) یعنی تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اخلاق میں اچھا ہو۔ گویا کہ اخلاق آدمی کے ایمان و اسلام کی پہچان ہے۔ جتنا اچھا اخلاق، اُتنا ہی اچھا اسلام۔

اصل یہ ہے کہ اخلاق کوئی علیٰحدہ صفت نہیں۔ وہ آدمی کے داخلی ایمان کا خارجی ظہور ہے۔ ایمان آدمی کے اندر خوفِ خدا اور تواضع جیسی صفات پیدا کرتا ہے۔ یہ صفات جب انسانی سلوک کی سطح پر ظاہر ہوں تو اسی کا نام اخلاق ہے۔

جو آدمی لوگوں کے ساتھ سرکشی کرے اُس نے خدا کے آگے بھی سرنڈر نہیں کیا۔ جو آدمی دوسروں کے مقابلہ میں فخر کا اظہار کرے وہ خدا کے ساتھ بھی عاجز نہیں بنا۔ جو آدمی دوسرے انسانوں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرے اس کو گویا کہ اُس خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوئی جس کی صفت قرآن میں رحمٰن و رحیم بتائی گئی ہے۔

ہر آدمی خدا اور بندوں کے درمیان ہوتا ہے۔ خدا کے مقابلہ میں اُس سے جو چیز مطلوب ہے وہ تقویٰ ہے اور انسان کے مقابلہ میں اُس سے جو چیز مطلوب ہے وہ حُسنِ اخلاق ہے۔ انہی دونوں چیزوں کے مجموعہ سے وہ شخصیت بنتی ہے جس کو مومن کہا گیا ہے۔ یہ دونوں صفات ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ جہاں تقویٰ ہوگا وہاں حُسنِ اخلاق ہوگا اور جہاں حُسن اخلاق ہوگا وہاں تقویٰ بھی ضرور پایا جائے گا۔ ایک چیز کا نہ ہونا اپنے آپ یہ ثابت کرتا ہے کہ دوسری چیز بھی وہاں موجود نہیں۔

اچھا اخلاق کیا ہے اور برا اخلاق کیا۔ اچھا اخلاق دراصل مثبت ردعمل کا دوسرا نام ہے۔ اور اسی

طرح برا اخلاق منفی ردعمل کا دوسرا نام۔ آدمی جب سماج میں جیتا ہے یا وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے تو ہر وقت اس کو دوسروں کی طرف سے مختلف قسم کے سلوک کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر وہ لوگوں سے مثبت ذہن کے ساتھ معاملہ کرے تو وہ اچھے اخلاق والا آدمی ہے اور اگر وہ لوگوں سے منفی سوچ کے ساتھ معاملہ کرے تو اس کو برے اخلاق والا آدمی کہا جائے گا۔

اس اخلاقی روش کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ آدمی جہاں بھی ہو اور جس حال میں بھی ہو اس کو دو میں سے ایک روش کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی اچھے اخلاق والا انسان ہے یا برے اخلاق والا انسان۔

مثبت اخلاق یہ ہے کہ آدمی فریق ثانی کے رویہ سے غیر متاثر رہ کر اعلیٰ انسانی اصول کی روشنی میں اپنا کردار بنائے۔ اس کے مقابلہ میں منفی اخلاق یہ ہے کہ آدمی فریق ثانی کی روش سے متاثر ہو جائے، وہ اعلیٰ انسانی اصولوں کو بھول کر جوابی کردار کا مظاہرہ کرنے لگے۔

حسن اخلاق دراصل ایک اعلیٰ انسانی اصول کا نام ہے۔ حسن اخلاق کا تقاضہ ہے کہ آدمی جہاں بھی ہو اور جس حال میں بھی ہو، وہ یک طرفہ طور پر اخلاقی اصول پر قائم رہے۔ وہ خاندان کے اندر بھی بااخلاق ہو اور پڑوس کے اندر بھی بااخلاق۔ وہ کسی ریاست کا عہدیدار ہو تب بھی وہ بااخلاق ہو اور تعلیمی ادارہ کا معلم ہو تب بھی بااخلاق۔ وہ اسٹیج کا مقرر ہو تب بھی وہ بااخلاق ہو اور اخبار کا صحافی ہو تب بھی بااخلاق۔ وہ تاجر ہو تب بھی بااخلاق ہو اور گاہک ہو تب بھی بااخلاق۔ وہ مقیم ہو تب بھی بااخلاق ہو اور مسافر ہو تب بھی بااخلاق۔

وہ دوستی میں بھی بااخلاق ہو اور دشمنی میں بھی بااخلاق۔ وہ لینے کے وقت بھی بااخلاق ہو اور دینے کے وقت بھی بااخلاق۔ وہ اتفاق کے وقت بھی بااخلاق ہو اور اختلاف کے وقت بھی بااخلاق۔ وہ دباؤ کے وقت بھی بااخلاق ہو اور دباؤ نہ ہو تب بھی بااخلاق۔ وہ اپنوں کے ساتھ بھی بااخلاق ہو اور غیروں کے ساتھ بھی بااخلاق۔

حسن اخلاق کی روش پر قائم رہنے کی صورت کیا ہے۔ کیسے یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی آدمی

لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے حسن اخلاق کے اصولوں کو نہ چھوڑے۔ اس کا واحد راز محاسبہ (accountability) کا تصور ہے۔ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بار بار ایسے تجربے پیش آتے ہیں جو آدمی کو حسن اخلاق کی روش سے ہٹادیں۔ ایسے موقع پر اگر آدمی اس احساس سے خالی ہو کہ خدا کے یہاں اس کی پکڑ ہونے والی ہے تو وہ اپنی خواہش پر چلے گا، وہ اپنے نفس کی پیروی کرنے لگے گا، اس کو جب کسی پر غصہ آئے گا تو وہ انتقام تک پہنچ جائے گا، وہ جب کسی کو اپنے سے بڑا دیکھے گا تو وہ حسد اور جلن کا شکار ہو جائے گا، اس کو کسی سے اختلاف ہو تو وہ بے انصافی کی بولی بولنے لگے گا، کسی سے اس کو ٹھیس پہنچے تو اس کو اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک وہ اس سے بدلہ نہ لے لے۔

اس کے مقابلہ میں بداخلاقی کی روش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آدمی خدا کی پکڑ سے بے خوف ہو جائے۔ اس کو یہ ڈر نہ ہو کہ اس کے منھ سے جو بول نکلیں گے وہ خدا کے یہاں لکھ لیے جائیں گے۔ وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں سے جو عمل کرے گا وہ خدا کے یہاں، ریکارڈ ہو جائے گا اور پھر قول و عمل کے اس ریکارڈ کی بنیاد پر خدا کے یہاں اس کے لیے ابدی جنت یا ابدی جہنم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ جو آدمی حساب کے اس آنے والے دن سے بے خوف ہو جائے وہ بے قید ہو کر ہر وہ کام کرے گا جو اس کا جی چاہے، جو اس کے جذبات کو تسکین دینے والا ہو۔

موجودہ دنیا میں آدمی بظاہر اپنے آپ کو آزاد پاتا ہے۔ یہی آزادی ہر قسم کی بداخلاقیوں کی جڑ ہے۔ حسن اخلاق پر قائم رہنے کی واحد صورت یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ وہ محاسب و مجازی خدا کے ماتحت ہے، وہ کسی بھی حال میں خدا کی پکڑ سے بچنے والا نہیں۔ یہ احساس آدمی کے اندر سلف کنٹرول کی اسپرٹ پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے آپ کو اخلاقی ڈسپلن میں رکھے۔ وہ اپنے آپ کو اخلاقی اصولوں کا پابند بنائے۔ وہ خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو اخلاق کی رسی میں باندھ لے۔

حسن اخلاق کا تعلق بظاہر دوسروں سے ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس کا تعلق سب سے زیادہ خود صاحب اخلاق سے ہوتا ہے۔ اخلاق کسی انسان کی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

ایک قسم کے اخلاق سے اعلیٰ انسانی شخصیت بنتی ہے اور دوسرے قسم کے اخلاق سے بری شخصیت تشکیل پاتی ہے۔

آپ کو کسی سے اختلاف یا شکایت ہو اس کے باوجود آپ اس کے بارے میں انصاف کا بول بولیں تو آپ کا یہ بول آپ کے اندر ایک بلند انسانی شخصیت کی تعمیر کرے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ ایسا کریں کہ جس سے آپ کو اختلاف یا شکایت ہو جائے آپ ہر موقع کو استعمال کر کے اس کی کردار کشی (character assassination) کرنے لگیں تو اس کے نتیجہ میں آپ کے اندر ایک پست شخصیت بننے لگے گی۔ بداخلاقی کی روش خود اپنے آپ کو قتل کرنے کے ہم معنٰی ہے اور حسن اخلاق کی روش اپنے آپ کو نئی زندگی دینے کے ہم معنٰی۔

اس مثال سے دوسری صورتوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر اخلاقی روش انسان کی اپنی شخصیت کو یا تو بناتی ہے یا بگاڑتی ہے۔ وہ انسان کے اپنے داخلی وجود کو یا تو زندگی دیتی ہے یا اس کو ہلاک کر دیتی ہے۔ حسن اخلاق سب سے پہلے آدمی کا اپنا مسئلہ ہے اور اس کے بعد وہ دوسروں کا مسئلہ۔

حسن اخلاق آدمی کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں پہنچانے والا ہے۔ اس کے برعکس بداخلاقی کی روش آدمی کو خدا کی رحمتوں سے دور کر دیتی ہے۔ بداخلاقی کا رویہ بظاہر آدمی کسی دوسرے کے خلاف کرتا ہے مگر عملاً وہ خود اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔ آدمی اگر بداخلاقی کے اس نقصان کو جانے تو وہ کبھی کسی کے خلاف بداخلاقی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

دعوت کا عمل

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو آزمائش کے لیے پیدا کیا (الملک ۲) موجودہ دنیا میں انسان کو مکمل آزادی دی گئی ہے۔ یہ آزادی انسان کا ذاتی حق نہیں بلکہ وہ امتحان کی مہلت ہے۔ جو شخص خدا کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی گزارے گا اس کو خدا ابدی جنت میں جگہ دے گا اور جو شخص خدا کے نقشہ کے خلاف چلے گا اس کو خدا ابدی جہنم میں ڈال دے گا۔ یہ نقشۂ حیات کیا ہے۔ اس کو بتانے کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ قرآن میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وان علینا للھدیٰ (اللیل ۱۲) یعنی یہ خدا کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسان کو صحیح راستہ دکھائے:

Surely it is for God to guide mankind.

اس مقصد کے لیے خدا نے ایک قابل اعتماد انتباہی نظام (warning system) قائم کیا۔ اس انتباہ کے لیے خدا نے یہ کیا کہ انسان کی تاریخ کے آغاز ہی سے اپنے پیغمبر انسان کے پاس بھیجنا شروع کیا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے — اللہ نے رسولوں کو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت باقی نہ رہے (النساء ۱۶۵) قرآن میں مزید بتایا گیا ہے کہ خدا کے یہ پیغمبر بلا وقفہ لگاتار بھیجے جاتے رہے (المؤمنون ۴۴)

پیغمبروں کے اس سلسلہ کی آخری کڑی محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب تھے۔ ۶۳۲ء میں مدینہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ خدا کے فیصلہ کے مطابق، آپ کے بعد کوئی اور پیغمبر آنے والا نہیں۔ تاہم نبوت کے کام کی ضرورت بدستور باقی ہے۔ خدا نے یہ فیصلہ کیا کہ پیغمبر آخر الزماں کے بعد لوگوں کو آگاہ کرنے کا یہ کام آپ کی امت کے ذریعہ انجام دیا جائے۔ خدا کے اس فیصلہ کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ بنو (الحج ۷۸)

اس خدائی انتظام کے تحت یہ ہوا کہ پیغمبر آخر الزماں کے بعد حق کی پیغام رسانی کا کام آپ کی

امت کے ذریعہ ہونے لگا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے لے کر اٹھارویں صدی کے نصف اول تک یہ کام بذریعہ امت مسلسل جاری رہا۔ اس کے بعد خدا نے اپنے خصوصی انتظام کے تحت دعوت کے اس کام کو خود انسانی تاریخ میں ایک عمل (process) کے طور پر داخل کر دیا۔ اس طرح اس انتہائی نظام کے تین دور قرار پاتے ہیں۔

۱۔ رسولوں کے ذریعہ آغاز انسانیت سے ساتویں صدی کے نصف اول تک۔

۲۔ امت محمدی کے ذریعہ ساتویں صدی کے نصف ثانی سے لے کر اٹھارویں صدی کے نصف اول تک۔

۳۔ تاریخی عمل کے ذریعہ اٹھارویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بعد کے زمانہ تک۔

پیغمبر اسلام کے بعد آپ کی امت کو دنیا کے بڑے رقبہ میں سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا۔ اس اقتدار کے زمانہ میں مسلمان نسل در نسل کم و بیش دعوت کے عمل کو انجام دیتے رہے۔ اس پر امن دعوتی عمل کی تفصیل ٹی ڈبلیو آرنلڈ کی ۵۰۸ صفحہ کی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کا نام یہ ہے:

The preachings of Islam (1896)

اٹھارویں صدی میں یہ ہوا کہ یورپ کی نو آبادیاتی قومیں نئی طاقتوں سے مسلح ہو کر اٹھیں اور انہوں نے پوری مسلم دنیا پر سیاسی غلبہ قائم کر دیا۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، مسلمانوں کے لیے یہ داخلی احتساب (introspection) کا وقت تھا مگر مسلم رہنما ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے اس وقت مسلمانوں کو شکایت اور احتجاج میں مبتلا کر دیا۔ وہ غالب قوموں کے خلاف نفرت اور انتقام کی نفسیات میں جینے لگے۔

یہ منفی ذہن ابتداءً یورپی قوموں کے خلاف پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ پھیلتا رہا یہاں تک کہ وہ تمام غیر مسلم قوموں تک پہنچ گیا۔ یورپی، امریکی، عیسائی، یہودی، ہندو، غرض دنیا کی تمام قومیں مسلمانوں کے لیے نفرت کا موضوع بن گئیں۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان دعوت الی اللہ کے کام کے لیے پوری طرح نااہل ہو گئے۔ انسانی خیر خواہی (human interest) ان کا کنسرن (concern)

نہ رہا۔ وہ اپنی قوم اور غیر قوم کی بنیاد پر تقسیم میں جینے لگے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلمانوں کی ۵۷ آزاد حکومتیں بن گئیں۔ مگر مسلمانوں کی نفرت اغیار بدستور باقی ہے۔ کیوں کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اپنی کوتاہی کا الزام دوسروں کو دینا چاہتے تھے۔

اب مسلمانوں میں دعوتی تحریکوں کے بجائے جہادی تحریکیں جاری ہوگئیں۔ پہلے صوفیاء پرامن دعوتی تحریک کی علامت تھے۔ اب یہ ہوا کہ ساری مسلم دنیا میں سیاسی تحریکیں مسلح جہاد کی علامت بن کر ابھر آئیں۔ صوفیاء کا مزاج صلح کل (peace with all) کے اصول پر قائم تھا۔ لیکن ردعمل کے تحت اٹھنے والی سیاسی تحریکوں کا نعرہ یہ ہوگیا کہ — آؤ ہم جنگ کریں، آؤ ہم جنگ کریں، کیوں کہ جنگ ہی کامیابی کا راستہ ہے:

هلم نقاتل هلم نقاتل فان القتال سبيل الرشاد

جہاد و انقلاب کے نام پر اٹھنے والی ان سیاسی تحریکوں نے ساری دنیا میں غیر مسلم قوموں کو نفرت کا موضوع بنا دیا۔ ان کی سوچ نفرت کی سوچ بن گئی۔ تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمان نفرت کی زبان میں کلام کرنے لگے۔ اس طرح ساری دنیا کے مسلمانوں نے یہ صلاحیت کھودی کہ وہ غیر مسلم قوموں کو خدا کے دین کا پیغام پہنچا سکیں۔

مگر خدا کا انتباہی نظام (warning system) رکنے والا نہ تھا۔ خدا جس طرح سورج کے ذریعہ مادی روشنی دنیا والوں کو پہنچا رہا ہے۔ اسی طرح خدا کو یہ مطلوب ہے کہ دعوت اسلام کے ذریعہ سچائی کی روشنی بلا انقطاع دنیا والوں تک پہنچتی رہے۔ چنانچہ جب مسلمان اپنی منفی نفسیات کی بنا پر دعوت کے کام کے لیے نااہل ہوگئے تو وہ واقعہ ہوا جس کو مسیح نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر انسان چپ رہیں تو پتھر چلا اٹھیں گے:

I tell you that if these should keep silent, the stones would immediately cry out. (Luke, 19:40)

واقعات بتاتے ہیں کہ ۱۹ ویں صدی اور ۲۰ ویں صدی میں مسلمانوں نے دعوت کا عمل

پوری طرح چھوڑ دیا۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی مدعو قوموں کو اپنا دشمن سمجھ لیا۔ وہ ان کو ہلاک کرنے کے درپے ہو گئے۔ ان کی مسجدوں میں مدعو قوموں کے خلاف ہلاکت اور تدمیر دیار کی بددعائیں ہونے لگیں۔ ان کے نوجوان مدعو قوموں کے خلاف ہر ممکن تشدد کرنے لگے۔ اس طرح دعوتی عمل کے لیے مسلمانوں کی نااہلی آخری طور پر ثابت ہو گئی۔ اس بنا پر مسلمانوں کے ساتھ خدا کا معاملہ وہ ہوا جس کو بائبل کے ایک پیغمبر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وہ مردود چاندی کہلائیں گے کیوں کہ خداوند نے ان کو رد کر دیا ہے:

People will call them rejected silver, because the Lord has rejected them. (Jeremiah, 6:30)

اب دعوتی عمل کا وہ دور شروع ہوا جس کو ہم نے تیسرا دور کہا ہے۔ اب خدا نے یہ کیا کہ خود تاریخ انسانی میں دعوت کے کام کو ایک پراسس (process) کے طور پر داخل کر دیا۔ یہ پراسس اس دور میں شروع ہوا جس کو دوسرے الفاظ میں مابعد سائنسی دور (post-scientific era) کہا جاتا ہے۔ اس تاریخی عمل کا اشارہ حدیث میں ان الفاظ میں پایا جاتا ہے:

لایبقی علی ظهر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا ادخله الله کلمة الاسلام

(مسند احمد ۶/ ۴) یعنی زمین کی سطح پر کوئی گھر یا خیمہ نہیں بچے گا مگر یہ کہ خدا اس کے اندر اسلام کا کلمہ داخل کر دے گا۔

اس حدیث میں کلمۂ اسلام کی عمومی اشاعت کے عمل کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے جب کہ دعوت کے پہلے دور میں اس کو رسولوں کی طرف اور اس کے دوسرے دور میں اس کو امت محمدی کی طرف منسوب کیا گیا تھا۔ گویا انسانی زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دعوت کے تیسرے دور میں خدا دعوتی عمل کا چارج خود اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ مذکورہ حدیث میں اس بات کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ جب ایسا ہوگا تو دعوتی عمل کی رفتار بھی بہت تیز ہو جائے گی۔

موجودہ زمانہ میں یہ تیسرا دعوتی منصوبہ پوری طرح واقعہ بن چکا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ

مسلمانوں کی طرف سے کسی دعوتی کوشش کے بغیر اسلام اپنے آپ نہایت تیزی سے پورے کرۂ ارض میں پھیل رہا ہے۔ مسلمان اپنی منفی سیاست کی بنا پر اپنی مسجدوں میں غیر مسلم قوموں کے لیے اللھم اھلکھم، اللھم دمر دیارھم کی بددعائیں کر رہے تھے۔ مگر خدا اس کے برعکس غیر مسلموں کے دل میں دین حق کی آواز پہنچا رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ غیر مسلم قومیں تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہونے لگیں۔

مذہب کے حوالے سے حال میں جو عالمی جائزے شائع ہوئے ہیں ان کے مطابق، اس وقت صرف امریکا میں ہر سال تقریباً ایک لاکھ (100,000) لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مختلف عالمی جائزوں کے مطابق، اسلام اس وقت ہر دوسرے مذہب کے مقابلہ میں زیادہ تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ ان رپورٹوں میں اس قسم کے الفاظ پڑھنے کو ملتے ہیں:

1. Islam is the fastest growing religion in the world.

2. Islam is world's fastest growing religion.

3. The religion of Islam is growing faster than any other religion in the world. (Radiance weekly, New Delhi, 19-25 Dec. 2004)

اسلام کی یہ تیز رفتار اشاعت اتفاقی نہیں ہے۔ وہ مسلمانوں کی کسی دعوتی کوشش کا نتیجہ بھی نہیں۔ وہ مکمل طور پر خدا کی منصوبہ بندی کے تحت پیش آیا ہے۔ یہ واقعہ خدا کے اس قانون کے تحت ظاہر ہوا ہے جس کو مذکورہ حوالہ کے مطابق بائبل میں اس طرح کہا گیا تھا کہ انسان اگر نہ بولیں تو پتھر بولیں گے (If man failed to speak, stones would speak)۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے دوسری قوموں کو قابل نفرت سمجھ کر ان کو اسلام کی طرف بلانا چھوڑ دیا تو ''پتھر'' خدا کی طرف سے بولنے لگے۔ اس تاریخی عمل کو سمجھنے کے لیے یہاں اس نوعیت کی کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ اس سلسلہ میں غالباً پہلی تبدیلی وہ ہے جس کو پرنٹنگ پریس کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ یہ ایک بہت دیر طلب کام تھا۔ کیوں کہ لمبی مدت کے بعد صرف چند کتابیں ہاتھ سے لکھ کر تیار کی جا سکتی تھیں۔ پرنٹنگ پریس کی دریافت نے اس کو ممکن بنا دیا کہ کسی کتاب

کا ایک صحیح نسخہ لکھا جائے اور پھر بہت کم مدت میں اس کی لاکھوں کاپیاں تیار کرلی جائیں۔ اس طرح چھپی ہوئی کتابوں کے ذریعہ اشاعت اسلام کا عمل سیکڑوں گنا زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہوگیا۔ کتابوں کے مطالعہ کے ذریعہ لاکھوں لوگ اپنے آپ اسلام کے قریب آئے۔ مثلاً ہنگری کے مستشرق ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس نے اسی طرح کتابوں کے ذریعہ سے اسلام کو جانا اور اس کو قبول کرلیا۔

۲۔ موجودہ زمانہ میں نئی قسم کی تیز رفتار سواریاں وجود میں آئیں، اسٹیم شپ، ریلوے ٹرین، موٹر کار، ہوائی جہاز، وغیرہ۔ ان نئی سواریوں کی ایجاد کے بعد سفر بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ دنیا میں اختلاط (interaction) میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ لوگ دنیا کے ہر حصہ میں آنے اور جانے لگے۔ اس طرح انسانی اختلاط کے دوران براہ راست یا بالواسطہ طور پر دعوت کا عمل ہونے لگا۔ اس کی ایک مثال آسٹریا کے لیوپولڈ اسد کی ہے۔ وہ جرنلسٹ کے طور پر سعودی عرب گئے۔ وہاں لوگوں سے ملاقاتوں کے دوران اُنہوں نے اسلام کو دریافت کیا اور پھر بطور خود اسلام میں داخل ہوگئے۔

۳۔ موجودہ زمانہ میں ٹیلی ویژن نے اتنا زیادہ پھیلاؤ حاصل کیا ہے کہ ہر جگہ اور ہر گھر میں ٹی وی سٹ پہنچ گیا ہے۔ ٹی وی نے جس طرح دوسری خبروں کو نشر کیا اسی طرح اسلام کے متعلق خبروں کو بھی وہ روزانہ نشر کرنے لگا۔ مثال کے طور پر سعودی عرب کے شاہ فیصل کو جب گولی ماری گئی تو آخر وقت میں ان کی زبان سے نکلا اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا عبده و رسوله۔ اس واقعہ کو ساری دنیا میں ٹیلی ویژن اسکرین پر باتصویر انداز میں دکھایا گیا۔ اس طرح کے ہزاروں واقعات ہیں جو ہر دن ٹی وی اسکرین پر آتے رہتے ہیں اور اس طرح اسلام کا پیغام کسی نہ کسی صورت میں ہر گھر میں پہنچ رہا ہے۔ میرے ذاتی علم کے مطابق، دہلی کے ایک بڑے تاجر رام رتن کپلا ٹی وی کے پروگراموں کو دیکھ کر اسلام سے متعارف ہوئے اور پھر اسلام قبول کرلیا۔

۴۔ سائنس کے زیر اثر موجودہ زمانہ میں جو نئی چیزیں پیدا ہوئیں اُن میں سے ایک وہ ہے جس کو روح تجسس (spirit of enquiry) کہا جاتا ہے۔ سائنس کی نئی نئی دریافتوں نے لوگوں کے

اندر بہت بڑے پیمانہ پر تجسس کی روح جگادی۔ یہ تجسس مادی دنیا کے مطالعہ سے شروع ہوا اور پھر وہ تمام شعبوں تک پھیل گیا۔ چنانچہ اس کے زیر اثر مذاہب کا مطالعہ بھی بہت بڑے پیمانہ پر کیا جانے لگا۔ انسانی تاریخ میں یہ ایک نیا ظاہرہ تھا۔ اس کے نتیجہ میں بہت بڑی تعداد میں لوگ اسلام سے متعارف ہوئے۔ مثال کے طور پر بنگال کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیا اسی طرح اسلام کے قریب پہنچے اور پھر وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

قدیم زمانہ میں مذاہب کا مطالعہ متعصبانہ انداز میں کیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ چیزوں کو سائنٹفک نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس کے نتیجہ میں مذاہب کا غیر متعصبانہ مطالعہ پیدا ہوا۔ مطالعہ کا یہ سلسلہ اسلام تک بھی پہنچا۔ چنانچہ میرے ذاتی علم کے مطابق، موجودہ زمانہ میں اسلام کے موضوع پر لکھی جانے والی اکثر بہترین کتابیں وہ ہیں جو غیر مسلموں نے لکھی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

1. Prof. T.W. Arnold, The preachings of Islam.
2. Dr. Mourice Bukaue, Bible, The Science and Qur'an.
3. Dr. Michael H. Hart, The 100
4. Karen Armstrong, Mohammad

۶۔ سائنسی تحقیقات کے تحت جو چیزیں دریافت ہوئیں وہ اصلاً سیکولر تحقیق کا نتیجہ تھیں۔ مگر ان کے ذریعہ سے بہت سے ایسے حقائق سامنے آئے جو قرآن کے عقائد کی سائنسی تصدیق کے ہم معنٰی تھے۔ ان حقائق کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ایک تحقیق کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، وہ ہے بگ بینگ (Big Bang) کا نظریہ۔

۷۔ جدید دور میں بنوفکری انقلابات آئے ان میں سے ایک اہم انقلاب وہ تھا جس کو مذہبی آزادی (religious freedom) کہا جاتا ہے۔ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ آج انسان کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوئی۔ جب تک کوئی شخص تشدد نہ کرے اس کو مذہب کی مکمل آزادی حاصل رہے گی۔ اسی آزادی نے اس قدیم برائی کو ختم کیا جس کو مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا

ہے۔اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج مسیحی دنیا میں اتنے بڑے بڑے اسلامی مراکز قائم ہیں جو مسلم ملکوں میں بھی نہیں۔اس تبدیلی نے موجودہ زمانہ میں اسلام کی اشاعت کے تمام بند دروازے کھول دیے۔اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اقوامِ عالم کی عالمی تنظیم (U.N.O) کے تحت دنیا کی تمام قوموں نے سرکاری طور پر یہ اعلان کیا کہ ان کے ملکوں میں لوگوں کو کامل مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔کسی کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ کسی کی مذہبی آزادی میں رکاوٹ ڈالے۔اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ کسی رکاوٹ کے بغیر اسلام کا پیغام ہر جگہ پہنچنے لگے۔

۸۔جدید دور میں سائنسی مطالعہ نے ایک کام یہ کیا ہے کہ اُس نے شرک کی نظریاتی جڑ کاٹ دی۔قدیم زمانہ میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جب کئی طرح کی چیزیں ہیں تو خداؤں کی تعداد بھی کئی ہوگی۔اسی کے زیر اثر شرک (polytheism) کا عقیدہ پیدا ہوا۔موجودہ زمانہ میں سائنسی تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ بظاہر مختلف ہونے کے باوجود تمام چیزوں کی اصل بالآخر ایک ہے۔اور وہ ایک برقی لہر ہے جس کو الکٹران (electron) کہا جاتا ہے۔اسی لیے ایک سائنسداں نے کہا ہے کہ:

The world is nothing but a mad dance of electrons.

اس طرح جدید دریافت نے شرک کو بے بنیاد ثابت کیا اور توحید کے حق میں ایک نظریاتی بنیاد فراہم کردی۔

۹۔موجودہ زمانہ میں جو نئی چیزیں وجود میں آئی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کو ادارے (institutions) کہا جاتا ہے۔قدیم زمانہ میں انسانی سماج میں صرف ایک ہی ادارہ ہوا کرتا تھا، اور وہ سیاسی ادارہ تھا جس میں صرف بادشاہ کو سپریم حیثیت حاصل ہوتی تھی۔موجودہ زمانہ میں سیاست کا دائرہ محدود ہوگیا اور یہ ممکن ہوگیا کہ غیر سیاسی ادارے قائم کرکے وہ سب کچھ آزادانہ طور پر کیا جاسکے جس کو پہلے صرف سیاسی ادارہ کے تحت ہی ممکن سمجھا جاتا تھا۔اس طرح تاریخ میں پہلی بار سیاسی اقتدار کا مرکزی رول ختم ہوگیا۔اب سیاسی اقتدار کے بغیر سب کچھ کرنا ممکن ہوگیا۔اس عموم میں بلاشبہہ مذہب کی آزادانہ اشاعت بھی شامل ہے۔

۱۰۔حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللھم لاعیش الاّ عیش الآخرۃ (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب ما جاء فی الرقاق، وأن لا عیش إلاّ عیش الآخرۃ)۔یعنی عیش (pleasure) دنیا میں نہیں، وہ صرف آخرت میں ہے۔اسلام دعوتِ آخرت ہے۔اس اعتبار سے اس حقیقت کا نہایت گہرا تعلق دعوت کے عمل سے ہے۔مگر قدیم زمانہ میں یہ حقیقت زیادہ تر عقیدہ کی حیثیت رکھتی تھی۔موجودہ زمانہ میں اس کی حیثیت ہر ایک کے لیے ذاتی تجربہ کی ہوگئی ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو خدا نے ایک معیار پسند (perfectionist) مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔مگر ہر ایک کو موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں موجودہ دنیا میں رہنا پڑتا ہے، اور یہ دنیا ایک غیر معیاری دنیا (imperfect world) ہے۔طالب اور مطلوب کے درمیان یہی وہ تضاد ہے جس کی بنا پر دنیا کا ساز وسامان کسی کو حقیقی طور پر خوشی نہیں دیتا۔موجودہ دنیا کی یہ صورت حال ایک خاموش پیغام ہے کہ اے انسان، تو اگر اپنی مطلوب خوشی کو پانا چاہتا ہے تو اس کو موت کے بعد کی دنیا میں تلاش کر۔کیوں کہ موت سے پہلے کی دنیا میں وہ تجھ کو ملنے والی ہی نہیں۔

اسلامی دعوت کے اعتبار سے یہ بات بہت زیادہ اہم ہے۔مگر قدیم زرعی دور میں صرف بڑے بڑے مالکان زمین (landlords) ہی کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اس عظیم حقیقت کو ذاتی تجربہ کے تحت دریافت کرسکیں۔پنچانوے فیصد عوام اقتصادی ذرائع سے محروم ہونے کی بنا پر اس حقیقت کا ذاتی تجربہ کرنے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھے۔وہ شعوری طور پر اس حقیقت سے غافل رہ کر صرف اس حسرت میں جیتے تھے اور مرجاتے تھے کہ اگر ہمارے پاس دولت ہوتی تو ہم بھی دنیا کے اچھے سامان حاصل کرتے اور عیش وآرام کی زندگی گذارتے۔

موجودہ زمانہ میں صنعت اور ٹیکنالوجی میں جو ترقی ہوئی ہے اُس کا ایک پہلو وہ ہے جس کو اقتصادی انفجار (economic explosion) کہا جاسکتا ہے۔موجودہ زمانہ میں اقتصادی مواقع کے عمومی پھیلاؤ نے مال کو ہر آدمی کی دسترس تک پہنچا دیا ہے۔اب ہر آدمی کے لیے ممکن ہوگیا ہے کہ وہ

اچھے سامانِ حیات کے درمیان رہ سکے۔ اقتصادی توسیع کے اسی ظاہرہ کو حدیث جبریل میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أن ترى الحفاة العراة يتطاولون في البنيان (صحیح البخاری)۔

موجودہ زمانہ کو کنزیومرزم (consumerism) کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس زمانی تقاضے کے نتیجہ میں ہر عورت اور مرد کو یہ موقع ملا کہ وہ دنیا کی خوش نما چیزوں کو حاصل کر سکے اور ان کے درمیان جئے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ لوگ ان خوش نما چیزوں کے ملنے سے پہلے جتنے غیر مطمئن تھے، اُتنے ہی غیر مطمئن وہ اُن کے ملنے کے بعد بھی رہے۔ اس طرح مذکورہ حدیث میں بیان کی جانے والی حقیقت موجودہ زمانہ میں ہر عورت اور مرد کا ذاتی تجربہ بن گئی۔

اس طرح یہ ممکن ہو گیا کہ جب لوگوں کو جنت کی طرف بلایا جائے تو یہ بات ہر ایک کے لیے ایک قابلِ فہم بات ہو۔ ہر ایک اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر یہ سمجھ سکے کہ اسلام میں جنت کی دعوت بلا شبہہ ایک حقیقی دعوت ہے۔ ہر انسان اپنی فطرت میں دبے ہوئے جذبات کے تحت اپنے لیے ایک آئیڈیل دنیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کا یہ کہنا ہے کہ یہ آئیڈیل دنیا موت سے پہلے کی زندگی میں مل نہیں سکتی۔ وہ صرف موت کے بعد کی زندگی میں بشرطِ استحقاق ملے گی۔ اسلام کی یہ دعوت قدیم زمانہ میں زیادہ تر ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں وہ ذاتی تجربہ کے تحت ہر انسان کے لیے ایک معلوم حقیقت بن چکی ہے۔

دورِ جدید میں ظاہر ہونے والے ان واقعات نے اسلام کی دعوت و اشاعت کے لیے انتہائی وسیع نئے امکانات کھول دیے ہیں۔ یہ امکانات اتنے زیادہ طاقتور ہیں کہ وہ اپنے آپ لوگوں تک اسلام کو پہنچانے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ مسلمانوں نے اگر چہ غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا کام چھوڑ دیا تھا مگر مذکورہ قسم کے نئے واقعات کی بنا پر دعوت کا کام خود خدائی انتظام کے تحت جاری ہو گیا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں، اللہ تعالیٰ خود اپنے زور پر اپنے دین کا پیغام ساری دنیا میں ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں پہنچا رہا ہے۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ کوئی بھی عورت یا مرد اس پیغام سے بے خبر نہ رہے اور تمام انسانوں کے اوپر خدا کی حجت تمام ہو جائے۔

دارالاسلام، دارالکفر، دارالحرب

اسلام میں، قرآن وحدیث کے بعد، فقہ کو شریعت کا تیسرا ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم فقہ ایک استنباطی یا اجتہادی علم ہے نہ کہ مبنی بروحی علم۔ فقہ کی تدوین رسول اور اصحاب رسول کے بعد عباسی خلافت کے زمانہ میں ہوئی۔ اس دور کے فقہاء نے قرآن وحدیث سے استنباط کرکے جو نئی اصطلاحیں وضع کیں ان میں سے تین اصطلاحیں یہ تھیں — دارالإسلام، دارالکفر اور دارالحرب۔

فقہاء نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق، دار الاسلام، دار الکفر اور دار الحرب کی ذیلی تقسیمات بھی کی ہیں اور اس طرح ہر ایک دار کو کئی دار کی صورت میں بیان کیا ہے۔ مگر یہ ذیلی تقسیمات ہمارے نزدیک اضافی ہیں۔ ہم نے ذیلی تقسیمات سے قطع نظر کرتے ہوئے اس مقالہ میں صرف بنیادی تقسیم کو سامنے رکھا ہے اور اس سہگانہ تقسیم کے اعتبار سے ہر ایک کے شرعی احکام بیان کئے ہیں۔

عباسی دور کے جن فقہاء نے یہ اصطلاحیں بنائیں ان میں سے ہر فقیہہ کو بعد کے علماء نے مجتہد مطلق کا درجہ دے دیا تھا۔ اس لیے پچھلے ہزار سال میں کسی نے ان اصطلاحات کی صحت پر سوال نہیں اُٹھایا۔ لیکن اگر کھلے ذہن کے ساتھ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فقہاء کی یہ اصطلاحات یقینی طور پر روح اسلام کے مطابق نہ تھیں۔

فقہاء کی بنائی ہوئی یہ اصطلاحیں قرآن وسنت میں موجود نہ تھیں۔ فقہاء نے اپنے حق اجتہاد کو استعمال کرتے ہوئے بطور خود ان اصطلاحوں کو وضع کیا۔ مگر یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اجتہاد کی کچھ شرطیں ہیں۔ جائز اجتہاد وہی ہے جس میں یہ شرطیں پوری طرح پائی جاتی ہوں۔ جس اجتہاد میں یہ شرطیں نہ پائی جائیں وہ یقینی طور پر غلط اجتہاد قرار پائے گا۔ اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ: المجتهد يخطئ ويصيب (مجتہد کا اجتہاد صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی)۔

اجتہاد شریعت کا ایک اصول ہے۔ علماء نے عام طور پر مانا ہے کہ اجتہاد کے اصول کا شرعی ماخذ وہ حدیث ہے جو صحابی رسول معاذ بن جبل کے حوالہ سے نقل ہوئی ہے۔ وہ حدیث یہ

ہے: عن معاذ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم حين بعثه إلى اليمن فقال كيف تصنع إن عرض لك قضاء قال أقضي بما في كتاب الله قال فإن لم يكن في كتاب الله قال فبسنة رسول الله قال فإن لم يكن في سنة رسول الله قال اجتهد رائي ولا آلو قال فضرب رسول الله صدری ثم قال الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يرضي رسول الله (ابوداؤد، کتاب الأقضیۃ، الترمذی، کتاب الأحکام، النسائی، کتاب القضاۃ، ابن ماجہ، کتاب المناسک، مسند احمد ۵/ ۲۳۰)

معاذ بن جبل کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں یمن بھیجا تو اُن سے کہا کہ اگر تمہارے سامنے کوئی معاملہ پیش آئے تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کروگے۔ انہوں نے کہا کہ میں خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا کہ اگر تم خدا کی کتاب میں نہ پاؤ۔ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ کی سنت کی رو سے فیصلہ کروں گا۔ فرمایا کہ اگر تم رسول اللہ کی سنت میں نہ پاؤ۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی نہیں کروں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اس اللہ کا شکر ہے کہ جس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔

علماء اور فقہاء کے نزدیک یہی حدیث اصولِ اجتہاد کا بنیادی ماخذ ہے۔ اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عالم کے لیے اجتہاد کرنا کب جائز ہے۔ وہ اُس وقت جائز ہے جب کہ خدا کی کتاب اور رسول خدا کی سنت میں زیر بحث مسئلہ کے بارے میں کوئی رہنمائی موجود نہ ہو۔ اگر کتاب وسنت میں متعلقہ مسئلہ کے بارہ میں واضح رہنمائی موجود ہو تو اجتہاد کرنا جائز نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن سے ثابت ہے کہ روزہ رمضان کے مہینہ میں مقرر کیا گیا ہے۔ اب روزہ کے مہینہ کے بارہ میں کسی کے لیے کوئی نیا اجتہادی حکم وضع کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں۔ ایسی حالت میں کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ فرض نمازوں کی تعداد کے بارہ میں اجتہاد کر کے اُس میں کمی یا بیشی کرے۔

اس اُصول کی روشنی میں دیکھئے تو دارالاسلام اور دارالکفر اور دارالحرب کی اصطلاحوں کے بارے میں کتاب وسنت میں واضح رہنمائی موجود ہے۔ ایسی حالت میں کسی عالم یا فقیہہ کے لیے یہ درست نہیں کہ اس رہنمائی کے باوجود وہ اس معاملہ میں اجتہاد کرکے بطور خود نئی اصطلاحیں وضع کرے۔

فقہاء نے جن حالات کی نشاندہی کرکے ان کے تسمیہ (nomenclature) کے لیے یہ تین بنیادی اصطلاحیں وضع کی ہیں وہ حالات مبینہ طور پر دورِ نبوت میں موجود تھے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حالات کے لیے فقہاء جیسی اصطلاحیں مقرر نہیں فرمائیں۔ ایسی حالت میں اصطلاح سازی کا یہ معاملہ اجتہادی اجازت سے خارج قرار پائے گا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں عین اسی نوعیت کے حالات تھے جن حالات کے حوالہ سے بعد کو فقہاء نے دارالکفر کی اصطلاح وضع کی۔ یعنی فقہاء کی تقسیم کے مطابق، بعثت سے لے کر ہجرت تک کا مکہ حکماً دارالکفر کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر نہ قرآن میں اور نہ حدیث میں ایسا کوئی حوالہ موجود ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ قبل از ہجرت (pre-migration) کے لیے دارالکفر کی اصطلاح مقرر کی گئی۔

رسول اللہ کی ہجرت کے بعد اہل مکہ نے کھلے طور پر آپ کے خلاف مسلّح کارروائی شروع کردی۔ اس طرح ہجرت کے بعد مسلمان اور اہلِ مکہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ جنگ (at war) ہوگئے۔ گویا ہجرت کے بعد (post-migration) مکہ میں عین وہی حالت پیدا ہوگئی جس کو ایک نام دینے کے لیے بعد کے فقہاء نے دارالحرب کی اصطلاح وضع کی۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، قرآن وحدیث میں بعد از ہجرت مکہ کے لیے کبھی ایسی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی۔ نہ قرآن میں اعلان کیا گیا کہ مکہ اب دارالحرب ہو چکا ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اُس وقت کے مکہ کے لیے دارالحرب کا لفظ استعمال فرمایا۔

جیسا کہ معلوم ہے، ہجرت کے بعد مدینہ میں پیغمبر اسلام کی سربراہی میں مسلمانوں کی وہ

اجتماعی تنظیم قائم ہوگئی جس کو اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ اس طرح ہجرت کے بعد مدینہ میں عین وہی حالت پیدا ہوگئی جس کو بتانے کے لیے فقہاء دارالاسلام کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ مگر اب بھی ایسا نہیں ہوا کہ قرآن میں اُس وقت کے مدینہ کے لیے دارالاسلام کا لفظ استعمال کیا جائے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت کے مدینہ کو کبھی دارالاسلام کا لقب عطا فرمایا۔ قرآن میں جنت کے لیے دارالسلام (یونس ۲۵) کا لفظ آیا ہے مگر کسی زمینی خطہ کے لیے دارالاسلام یا دارالایمان کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح قرآن میں منکرین حق کی اخروی قیام گاہ کو دارالبوار (ابراہیم ۲۸) کہا گیا ہے۔ مگر کسی زمینی خطہ کو قرآن میں دارالکفر یا دارالکفار نہیں کہا گیا۔ گویا کہ فقہاء کی تقسیم کے مطابق، دارالاسلام، دارالکفر اور دارالحرب جیسے حالات کی موجودگی کے باوجود یہ جائز نہیں کہ ان کو بتانے کے لیے دارالاسلام، دارالحرب یا دارالکفر کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ یہ اصطلاح سازی ایک بدعت ہے، نہ کہ سنت۔

مذکورہ تجزیہ واضح طور پر ثابت کرتا ہے کہ فقہاء نے جن ارضی تقسیمات کو بتانے کے لیے دارالاسلام اور دارالکفر اور دارالحرب کی اصطلاحیں وضع کیں، وہ تقسیمات خود زمانۂ نبوت میں عملاً ظہور میں آچکی تھیں۔ مگر ان کو بتانے کے لیے کتاب وسنت میں ان سہگانہ اصطلاحوں کا استعمال نہیں کیا گیا۔ ایسی حالت میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ عباسی دور کے فقہاء نے ان اصطلاحوں کو وضع کرنے میں حدود اجتہاد سے تجاوز کیا۔ فقہاء نے ایک ایسے معاملہ میں اجتہاد کیا جس کے لیے انہیں شرعی طور پر مجاز نہیں کیا گیا تھا۔

ایسی حالت میں محفوظ طور پر صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقہاء کی یہ اصطلاح سازی اجتہادی خطا کا ایک واقعہ تھا، وہ یقینی طور پر اجتہادی صحت کا واقعہ نہ تھا۔ ایسی حالت میں اسلام کے ایک اسٹوڈنٹ کو جائز طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس اجتہاد کو تسلیم نہ کرے۔ اگر شرعی زبان استعمال کی جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ ایک اصطلاحی بدعت تھی اور وہ بہر حال اس قابل ہے کہ اس کو رد کردیا جائے۔ کیوں کہ حدیث میں واضح طور پر آیا ہے کہ: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد

(البخاری، مسلم) یعنی جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز نکالے جو اُس میں نہیں ہے تو وہ قابل رد ہے۔

دار الاسلام اور دار الکفر اور دار الحرب کی اصطلاحات بطور خود وضع کرنے کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں، یہ بے حد سنگین معاملہ ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو عالمی طرز فکر (world view) سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے ذہنی رخ کو متعین کرتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی پوری سوچ کی تشکیل کرنے والا ہے۔ وہ مسلمانوں کے اندر شعب اللہ المختار (chosen people) کا ذہن بناتا ہے۔ یہ ذہن کسی قوم کے تنزل کی علامت ہے، اور جیسا کہ معلوم ہے، یہ ذہن یہودیوں میں اس وقت پیدا ہوا جب کہ وہ تنزل کا شکار ہو چکے تھے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا انسانی معاشروں کو دار الاسلام اور دار الکفر اور دار الحرب میں تقسیم کر کے نہیں دیکھتا۔ خدا تمام انسانوں کو ایک نظر سے دیکھتا ہے اور ایک ہی اصول کی روشنی میں وہ تمام انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے والا ہے۔ چنانچہ قرآن میں مسلمانوں کے اس ذہن کی سختی سے تردید کی گئی ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں خدا کے زیادہ محبوب بندے ہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا کے یہاں کسی شخص کی قدر و قیمت نسلی تعلق سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذاتی عمل سے متعین ہوتی ہے (النجم ۳۹) قرآن میں مسلمانوں کو یہودیوں کے ساتھ بریکیٹ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے: لیس بأمانیکم ولا أمانی أهل الكتاب من يعمل سوء ا يجز به (النساء ۱۲۳) یعنی نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو کوئی بھی برا کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ گروہی فضیلت یا گروہی نجات کا تصور قرآن میں ایک اجنبی تصور ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت کا مطالعہ کافی ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، ان میں سے جو کوئی ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور اس نے نیک کام کیا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ان کے لیے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے (البقرہ ۶۲) یعنی مسلم گروہ، مسیحی گروہ، یہودی گروہ سب گروہی

اعتبار سے خدا کے نزدیک یکساں ہیں۔ خدا کی عدالت میں کامیابی کا فیصلہ گروہی تعلق کی بنیاد پر نہیں ہوگا بلکہ حقیقی کردار کی بنیاد پر ہوگا۔

اس طرح کے قرآنی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ صحیح اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسانوں کو خدا کی نسبت سے (God vs man) دیکھا جائے نہ کہ مسلم ورسز نان مسلم (Muslim vs non-Muslim) کی نسبت سے۔ کسی کا جو مقام خدا کی نسبت سے متعین ہو وہی اس کا مقام ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مسلمانوں کی نسبت سے دوسرے انسانوں کا مقام (status) متعین کرنا ایک قومی نقطۂ نظر ہے، اس کا قرآن یا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کے خلاف ہے۔ کیوں کہ خدا نے یہ دنیا سارے انسانوں کے لیے بنائی ہے، نہ کہ صرف مسلمانوں کے لیے۔

قرآن میں خدا جب لوگوں کو خطاب کرتا ہے تو وہ بار بار ایھا الانسان اور ایہا الناس جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ایسی حالت میں قرآن کی روشنی میں دار کا تعین کرنا ہو تو کہا جائے گا کہ ساری دنیا دارالانسان ہے۔ ایک طرف خدا ہے اور دوسری طرف تمام انسان۔

مذکورہ اصطلاح سازی کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر وہ تفریقی نظریہ پیدا ہوا جس کو ہم اور وہ (we and they) کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت مسلمان انسانی تاریخ کو صرف اپنے ریفرنس میں دیکھنے لگے۔ وہ اپنی نسبت سے دوسروں کا درجہ متعین کرنے لگے۔ ایک کو انہوں نے مسلم قوم کہا اور دوسرے کو انہوں نے کافر قوم قرار دیا۔ اب یہ ہوا کہ جو لوگ ان کے اپنے ہم مذہب (co-religionist) تھے ان کو انہوں نے اپنا سمجھا اور جو لوگ دوسرے مذہب پر قائم تھے ان کو انہوں نے غیر (other) کی حیثیت دے دی۔ اپنے سوا جو دوسرے لوگ تھے وہ ان کے لیے یا تو کافر بن گئے یا امکانی دشمن (potential enemy)۔ قرآن کی ساری بشارتیں انہوں نے اپنے خانہ میں لکھ لیں اور قرآن کی ساری وعیدیں انہوں نے دوسروں کے خانہ میں ڈال دیں۔

انسانیت کا درجہ مسلمانوں کے حوالے سے مقرر کرنے کا یہ طریقہ سراسر قرآن کے خلاف تھا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن انسانیت کا درجہ خدا کی نسبت سے متعین کرتا ہے۔ فقہاء

نے دار کی جو تقسیم کی اس نے تاریخ بشری کے بارے میں ایک نیا نقطۂ نظر پیدا کیا۔ اس کے مطابق، سارا معاملہ مسلم ورسس نان مسلم کا معاملہ بن گیا۔ مگر قرآن کے مطابق، یہ معاملہ خدا ورسس انسان کا معاملہ ہے۔

بعد کے زمانہ میں دار کی نسبت سے بننے والی اس غلط تقسیم نے مسلمانوں کے طرز فکر کو نہایت گہرے طور پر متاثر کیا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کے بعد بننے والی پوری مسلم تاریخ میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ تقریباً سب کی سب مسلم اوریینٹڈ سوچ کے تحت لکھی گئیں۔ سید رشید رضا کی کتاب لما ذا تأخر المسلمون و تقدم غیرھم اور سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے ٹائٹل اسی طرز فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔

میرے علم کے مطابق، ہزار سال کی مسلم تاریخ میں عبد الرحمٰن ابن خلدون کی کتاب (مقدمہ ابن خلدون) کو چھوڑ کر غالباً کوئی بھی کتاب ایسی نہیں جو حقیقی معنوں میں انسان اوریینٹڈ سوچ کے تحت لکھی گئی ہو۔ اس مدت میں غیر مسلموں کو ایڈریس کرنے کے لیے جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب مناظرہ کے اصول پر لکھی گئیں۔ مثال کے طور پر ابن تیمیہ کی کتاب "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" اور مولانا قاسم نانوتوی کی کتاب اظہار الحق، وغیرہ۔ بعد کے زمانہ میں لکھی جانے والی کتابوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ انسانیت عامہ مسلمانوں کا کنسرن ہی نہیں۔

بعد کے زمانہ میں قرآن اور حدیث کی جو شرحیں لکھی گئیں وہ بھی بعد کو پیدا ہونے والی اس فکر سے متاثر نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں خیر امت (آل عمران ۱۱۰) کا لفظ آیا ہے۔ بعد کی تفسیروں میں اس لفظ کو مسلم کمیونٹی کا گروہی لقب سمجھ لیا گیا۔ چنانچہ یہ کہا جانے لگا کہ مسلمان خیر الامم ہیں: انھم خیر الامم (ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱/۳۹۱) اسی بات کو حالی نے اس طرح نظم کیا ہے:

وہ امت لقب جس کا خیر الامم تھا

حالاں کہ قرآن کی اس آیت میں خیر امت سے مراد کوئی نسلی گروہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد

صفاتی گروہ ہے۔ اس آیت میں ''خیر'' کی بشارت ان افراد کو دی گئی ہے جو اس کی مطلوب صفات سے متصف ہوں۔ چنانچہ عمر فاروق نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: من فعل فعلهم كان مثلهم (القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۴/ ۱۷۰) یعنی جو ان کے جیسا عمل کرے گا وہ اُن کے مانند ہوگا۔ گویا خیر امت کا مدار کردار پر ہے، نہ کہ کسی نسلی گروہ پر۔

اسی طرح سورہ الفاتحہ میں الضالین اور المغضوب علیہم کا مصداق عیسائیوں اور یہودیوں کو قرار دے دیا گیا۔ حالاں کہ یہ شخصی کردار کی بات ہے اور اس کا تعلق تمام انسانوں بشمول مسلمانوں سے ہے، نہ کہ کسی مخصوص مذہبی گروہ سے۔

حدیث کی شرحوں میں بھی اس کا اثر پوری طرح دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر روایات میں آیا ہے کہ مدینہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا۔ آپ اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ جنازہ کو دیکھ کر آپ کھڑے ہوگئے۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ: أليست نفساً۔ یعنی کیا وہ انسان نہیں:

Was he not a human being.

یہ واقعہ صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب من قام لجنازة يهودي کے تحت آیا ہے۔ پیغمبر اسلام کا یہ عمل واضح طور پر بتاتا ہے کہ ہر انسان عزت اور احترام کے قابل ہے، خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو۔ اس حدیث سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا یہ طریقہ ہے کہ ہر انسان کو اپنے جیسا انسان سمجھو۔ انسان کو دیکھ کر یہ یاد کرو کہ جس خدا نے مجھ کو پیدا کیا ہے اسی خدا نے اس دوسرے انسان کو بھی پیدا کیا ہے۔ مومن کو چاہیے کہ وہ انسان کو دیکھ کر خدا کے تخلیقی کرشموں کو یاد کرے۔ کسی انسان کا مشاہدہ اس کے لیے خدا سے تعارف کا ذریعہ بن جائے۔

یہ روایت بلاشبہہ احترام انسانیت کے بارہ میں پیغمبر اسلام کی سنت کو بتاتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ حدیث کے شارحین میں سے کسی کو اس واقعہ میں احترام انسانیت کا سبق نہیں ملا۔ اس کے برعکس لوگوں نے اس سنتِ رسول کی تشریح میں عجیب وغریب باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ

قیام واجب نہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ آپ موت کی فزع کو یاد کر کے کھڑے ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کا یہ قیام ایک اضطراری قیام تھا۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ ملائکہ کے احترام میں کھڑے ہو گئے جو جنازہ کے ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ ملک الموت کو یاد کر کے کھڑے ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جنازہ کے ساتھ بخور کی بو کی وجہ سے آپ بطور کراہت کھڑے ہو گئے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ اس لیے کھڑے ہو گئے کہ جنازہ آپ کے سر کے اوپر سے نہ گذرے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ وقتی بیان جواز کے لیے کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ابتداء میں آپ نے قیام فرمایا تھا مگر بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اب وہ مسلمانوں سے مطلوب نہیں، وغیرہ۔ (ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، جلد ۳، صفحہ ۲۱۴۔۲۱۶)

یہ تشریحات بلاشبہہ نادرست ہیں۔ مگر مخصوص مقفل سٹ کی بنا پر شارحین کو اس کا احساس نہیں ہوا کہ وہ سنتِ رسول کی ایسی تشریح کر رہے ہیں جو نعوذ باللہ سنت کی تصغیر کے ہم معنی ہے۔ یہ سلسلہ آج تک بدستور جاری ہے۔ موجودہ زمانہ میں پرنٹنگ پریس اور میڈیا کے بعد مسلمانوں کے درمیان بے شمار نئی سرگرمیاں جاری ہوئیں۔ کتابوں اور جرائد کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعہ مسلمانوں نے ان گنت سرگرمیاں جاری کیں۔ مگر یہ تمام سرگرمیاں براہ راست یا بالواسطہ طور پر سابق روش کا امتداد (continuation) تھیں۔ ان سرگرمیوں سے مسلمانوں کے اپنے قومی ذہن کو تو غذا ملی مگر غیر مسلموں کے لیے ان میں کوئی مثبت مواد موجود نہ تھا۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں میں ایک تازہ مثال نقل کروں گا۔ حال میں ایک مسلم ملک میں ایک قرآن ٹی وی قائم ہوا ہے جس کو عام طور پر کیو ٹی وی (QTV) کہا جاتا ہے۔ یہ کیو ٹی وی یا قرآن ٹی وی مسلمانوں کے درمیان بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ ٹی وی اگرچہ قرآن کے نام پر قائم کیا گیا ہے مگر حقیقتاً وہ صرف مسلم کمیونٹی کی نفسیات کو غذا پہنچانے والا ہے، وہ غیر مسلم ذہن کو ایڈریس نہیں کرتا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کا کمیونٹی ٹی وی ہے نہ کہ قرآن ٹی وی۔

نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمز (۴ دسمبر ۲۰۰۴) میں انڈیا کے معروف صحافی

مسٹر خشونت سنگھ کا تبصرہ اس موضوع پر چھپا ہے جس کا عنوان ہے: Spreading Islamophobia۔ اس عنوان کے تحت مسٹر خشونت سنگھ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

About the most disturbing phenomenon of the past decade is the widening divide between the Islamic and non-Islamic world..... I looked forward to the Pakistani channel, Q (Qur'an) TV, to take the lead in this direction. I made it a point to tune in every afternoon to see and hear how it was going about its mission. I was sorely disappointed. I expected it would address itself to non-Muslim audiences among which wrong notions about Islam persist. I found it focused intirely on Muslims to assure them that their faith was better than any other and anyone who disagreed is an ignoramus. (p. 10)

انڈین جرنلسٹ کے مذکورہ الفاظ تقریباً تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں پر صادق آتے ہیں۔ بعد کے زمانہ میں بننے والا یہ مزاج واحد سبب تھا جس کی بنا پر مسلمانوں کے اندر دعوت کا نشانہ سرے سے مفقود ہو گیا۔ مسلم اوریینٹڈ تھنکنگ مسلمانوں کو مسلم فرینڈلی بناتی ہے۔ جب کہ انسان اوریینٹڈ تھنکنگ مسلمانوں کو انسان فرینڈلی بنانے والی ہے۔ اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوا کہ مسلمان دعوہ ورک اور کمیونٹی ورک کے فرق کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ وہ کمیونٹی ورک کرتے ہیں اور اس کو دعوہ ورک کا نام دے دیتے ہیں۔

یہ سلسلہ بہت پہلے سے چلا آرہا ہے۔ فقہ احکام وشریعت کا بیان ہے۔ فقہ کے موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ مگر ان کتابوں میں دعوت اور تبلیغ کا باب سرے سے موجود نہیں۔ اسی طرح الغزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی، محمد اقبال اور دوسرے تمام مسلم مصنفین کی کتابیں دعوت کے تصور سے خالی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ فقہی تصور کے مطابق، مسلمانوں کے لیے غیر مسلم عملاً جہاد کا موضوع بن گئے، وہ اُن کے لیے سرے سے دعوت کا موضوع نہ بن سکے۔

اس غیر فطری طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم امت ایک طرف فکری جمود کا شکار ہو گئی اور دوسری طرف وہ دوسری قوموں کے لیے صرف ایک حریف گروہ بن کر رہ گئی۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان

داعی اور مدعو کا تعلق ختم ہوگیا۔ اس کے بجائے دونوں کے درمیان حریف اور رقیب کا تعلق قائم ہوگیا۔

فقہاء نے دار کی جو تقسیم کی ہے اس کے مطابق، انہیں دکھائی دیا کہ کوئی ملک یا تو دار الاسلام ہوگا یا دار الحرب ہوگا۔ اس معاملہ میں ان کی یہ تقسیمی سوچ اس حد تک پہنچی کہ اکثر فقہاء نے یہ کہا کہ غیر مسلم حکومت میں اگر اسلام کے احکام پر عمل کرنے کی آزادی ہو تب بھی وہ دار الحرب ہی رہے گا۔ ان فقہاء کے اندر اگر دعوت وتبلیغ کا شعور ہوتا تو وہ جانتے کہ یہاں ایک تیسری مطلوب صورت بھی موجود ہے، اور وہ دار الدعوہ ہے۔

دار الحرب کا لفظ غیر مسلموں کے لیے ایک قابلِ اعتراض لفظ ہے۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ میں دار الحرب کا تصور لے کر مسلمان کسی سماج میں معتدل انداز میں نہیں رہ سکتے۔ یہ عجیب وغریب صورت اس لیے پیش آئی کہ قدیم فقہاء صرف دو قسم کے دار سے واقف تھے۔ اگر وہ اسلام کی دعوتی تعلیمات کو سمجھتے تو وہ بہت آسانی سے جان لیتے کہ دوسرے ممالک مسلمانوں کے لیے دار الدعوہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ دوسرے ملکوں میں ہمیشہ دعوت کے مواقع موجود رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی ملک اگر قدیم مکہ کی طرح اہل توحید کا مخالف بن جائے تب بھی وہ بدستور دار الدعوہ بنا رہے گا۔ کسی ملک کی کوئی بھی حالت اس کی دار الدعوہ کی حیثیت کو ختم نہیں کرتی، جیسا کہ قرآن میں انبیاء کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔

اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ ساری دنیا انسانی قیام گاہ کے اعتبار سے دار الانسان ہے اور اسلامی مشن کے اعتبار سے دار الدعوہ۔ جن ملکوں کو دار الاسلام کہا جاتا ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے دار المسلمین تو ہو سکتے ہیں مگر دار الاسلام نہیں۔

قرآن میں پیغمبر کو ناصح (الأعراف ۶۸) کہا گیا ہے۔ یعنی اپنی مخاطب قوم کا خیر خواہ۔ گویا پیغمبر ناصح (خیر خواہ) ہے اور اس کی مخاطب قوم منصوح ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کی خیر خواہی کی جائے۔ اسی تعلق کو قرآن میں شاہد اور مشہود (البروج ۳) کہا گیا ہے۔ اس تعلق کو دوسرے الفاظ میں داعی اور مدعو کہہ سکتے ہیں۔

مسلمان ختم نبوت کے بعد، ذمہ داری کے اعتبار سے نبی کے قائم مقام (الحج ۷۸) ہیں۔ اس لیے ان کا معاملہ بھی دوسری قوموں کے مقابلہ میں ناصح اور منصوح یا داعی اور مدعو کا ہے۔ یہ نسبت مسلمانوں کے اخلاقی کردار کی تشکیل کرتی ہے۔ داعیانہ نفسیات کا تقاضہ ہے کہ مسلمان دوسری قوموں کے مقابلہ میں یک طرفہ طور پر حُسن کردار کی پابندی کریں۔ حتیٰ کہ وہ مدعو اقوام کی ایذاؤں پر صبر کریں۔ تاکہ دونوں کے درمیان دعوت کا ماحول باقی رہے۔

یہ داعیانہ کردار بلا شرط مطلوب ہے۔ اس یکطرفہ کردار کا تعلق جس طرح عوام سے ہے اسی طرح اس کا تعلق حکومت کے ذمہ داروں، پارٹیوں کے لیڈروں، میڈیا کے افراد اور دوسرے تمام سماجی طبقوں سے بھی ہے۔ مگر فقہ کی مذکورہ طبقاتی تقسیم نے اس تعلق کو توڑ دیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے دل میں دوسری قوموں کے خلاف شکایت اور نفرت کے جذبات بھر گئے۔ جب کہ مدعو ہونے کی حیثیت سے اُن کے ساتھ شکایت اور نفرت کا تعلق رکھنا اُن کے لیے جائز ہی نہ تھا۔

یہ بے حد سنگین معاملہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس پورے معاملہ کا ازسرِنو جائزہ (re-examine) کیا جائے۔ ازسرِنو جائزہ سے کم تر کوئی چیز اس مسئلہ کا حل نہیں بن سکتی۔

یہ بلا شبہہ ایک بے حد مشکل مسئلہ ہے۔ جب مسلم کمیونٹی کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہو جائے تو اس کے ساتھ بہت سے کمرشیل انٹرسٹ جڑ جاتے ہیں۔ اب ایک وسیع مسلم مارکیٹ وجود میں آجاتا ہے جس طرح یوروپین مارکیٹ اور ایشین مارکیٹ جیسے مارکیٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس مرحلہ میں پہنچ کر وہ مواقع پیدا ہو جاتے ہیں جب کہ دین کے نام پر دنیوی فائدے حاصل کیے جاسکیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں یہود کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: لاتشتروا بآیاتی ثمناً قلیلاً (البقرہ ۴۱)۔

موجودہ زمانہ میں مسلم دنیا اسی قسم کا ایک وسیع مارکیٹ بن چکی ہے۔ تسبیح اور مصلّی سے لے کر لٹریچر اور اسٹیج سب اس میں قیمتی سامانِ فروخت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو لوگ بھی مسلمانوں کے قومی جذبات کو فیڈ کریں وہ ان کے اندر اپنا عظیم بزنس ایمپائر کھڑا کر سکتے ہیں۔

طویل مدت کے اندر بنے ہوئے اس ذہن کی تصحیح دراصل تجدید (revival) کا کام ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ: من أحیا سنة امیتت بعدی فله اجر مأة شهید (جس نے میرے بعد میری کسی مردہ سنت کو زندہ کیا تو اس کے لیے سو شہیدوں کا اجر ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ سو بار لڑ کر شہید ہونا جتنا مشکل کام ہے اتنا ہی مشکل کام یہ ہے کہ کسی قوم کے اندر ایک ایسی سنت رسول کو دوبارہ زندہ کیا جائے جو صدیوں کے عمل سے گم ہوگئی ہو۔ اس کے لیے نہایت وسیع علم، دوررس منصوبہ بندی، گہری معرفت، حکیمانہ تدبیر، دانش مندی اور صبر کی وافر مقدار ضروری ہے۔ ان شرطوں کو پورا کئے بغیر اس قسم کا تجدیدی کام نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کام وہ ہے جس کو تجدید دین کہا جاتا ہے۔ تجدید کے اس کام کو موثر طور پر انجام دینا لوگوں کے مائنڈ سٹ کو توڑنے کے ہم معنی ہے۔ یہ کنڈیشنڈ ذہنوں کی ڈی کنڈیشننگ ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو تاریخ کوری پراسس کرنے کا طالب ہے۔ یہ ہزار سالہ تاریخ کو حذف کرکے اسلام کے دور اول کی طرف لوٹنا ہے اور اسلام کا مطالعہ دوبارہ اس فریم ورک میں کرنا ہے جو اسلام کے دور اول میں تشکیل پایا تھا۔ امت کی نشأۃ ثانیہ کے لیے یہ کام بلاشبہہ انتہائی حد تک اہم ہے۔

اس صورت حال نے امت کی اصلاح فکر کے کام کو بے حد مشکل بنا دیا ہے۔ جو لوگ اصلاح فکر کے اس مشن کو لے کر اٹھیں ان کو غیر مقبولیت کی قربانی دے کر یہ کام کرنا ہوگا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: بدأ الاسلام غریبا وسیعود کما بدأ فطوبی للغرباء (صحیح مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، رقم الحدیث ۱۵۹) یعنی اسلام شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا اور وہ دوبارہ ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ وہ شروع کے وقت تھا۔ تو مبارک ہیں وہ لوگ جو اس طرح اجنبی ہو جائیں۔

نکاح اور طلاق

عورت اور مرد کے درمیان تعلق کی جائز صورت صرف ایک ہے، اور وہ اعلان کے ساتھ نکاح ہے۔ یہی طریقہ فطرت کے مطابق ہے اور اسلام میں اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ تاہم دو زندہ انسان جب ساتھ مل کر رہیں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ اس اختلاف کو رفع کرنے کی صورت اسلام میں یہ بتائی گئی ہے کہ دونوں اس معاملہ میں مصالحت کا انداز اختیار کریں (النساء ۱۲۸) یعنی اختلاف کو مٹانے کی کوشش نہ کرنا بلکہ ناگزیر ضرورت کے طور پر اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے زندگی گزارنا۔ یہی اس مسئلہ کا واحد فطری حل ہے۔

تاہم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عورت اور مرد تنظیم اختلاف (difference management) کے اس اصول کو اپنانے میں ناکام رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے ازدواجی علیحدگی کا ارادہ کر لیتے ہیں جس کو طلاق کہا جاتا ہے۔ اسلام میں ایک مجبورانہ ضرورت کے طور پر طلاق کو جائز کیا گیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کی حوصلہ شکنی بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابغض الحلال الی اللہ الطلاق (مشکوٰۃ المصابیح) یعنی طلاق اگرچہ حلال ہے لیکن اللہ کے نزدیک وہ سخت ناپسند چیز ہے۔

طلاق کا ارادہ طرفین کے درمیان بیشتر حالات میں غصہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام میں طلاق کا ایک ایسا طریقہ تجویز کیا گیا جو عملاً طلاق پر روک لگانے کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: الطلاق مرتٰن فامساك بمعروف او تسريح باحسان (البقرہ ۲۲۹) یعنی طلاق رجعی دو بار ہے، اُس کے بعد دستور کے موافق یا تو رکھ لینا ہے یا بھلی طرح چھوڑ دینا ہے۔

یہ قرآن کے مطابق، طلاق کا مجوزہ طریقہ (prescribed method) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص طلاق دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو ایسا کرنا چاہیے کہ وہ پہلے مہینہ میں طہر کی حالت میں اپنی بیوی سے کہے کہ میں نے تم کو ایک طلاق دیا۔ اگر مہینہ پورا ہونے کے بعد بھی وہ طلاق

کے ارادہ پر قائم ہوتو اگلے مہینہ دوبارہ وہ کہے کہ میں نے تم کو دوسرا طلاق دیا۔ یہ دونوں طلاقیں رجعی شمار ہوں گی۔ یعنی شوہر کو حق ہوگا کہ وہ دو ماہ کی اس مدت کے دوران اپنی طلاق واپس لے لے۔ تیسرا مہینہ آنے کے بعد اگر اس نے تیسری بار کہہ دیا کہ میں نے تم کو تیسرا طلاق دیا تو رجوع کی مہلت ختم ہو جائے گی۔ اب دونوں کے درمیان شوہر اور بیوی کی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔

تین مہینہ کے درمیان تکمیل طلاق کا یہ طریقہ اس لیے رکھا گیا ہے تاکہ اگر وقتی غصہ کے تحت شوہر نے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد وہ دوبارہ اپنے ازدواجی تعلق کو بحال کر لے اور اگر اس کا ارادہ غیر جذباتی تھا اور تیسرے مہینہ بھی وہ اپنے ارادہ پر قائم ہے تو تیسرے مہینہ میں وہ طلاق کی تکمیل کر کے مکمل علیحدگی اختیار کر لے۔

اسلام کے دور اول میں طلاق کے اسی فطری طریقہ پر عمل تھا۔ خلیفۂ اول کے آخری زمانہ میں بعض مسلمانوں نے ایسا کیا کہ انہوں نے غصہ کے تحت ایک ہی بار میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی۔ یعنی ایک ہی مجلس میں کہہ دیا کہ تم کو طلاق، طلاق، طلاق۔ مگر اس وقت تک یہ معاملہ بہت استثنائی اور انفرادی تھا۔ خلیفہ ثانی عمر فاروق کی خلافت کے نصف آخر میں ایک مجلس میں تین طلاق کے واقعات زیادہ ہونے لگے۔

اب حضرت عمر فاروق نے خلیفہ کی حیثیت سے یہ فیصلہ کیا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو قانون کے اس غلط استعمال پر روک لگائے۔ چنانچہ اُنہوں نے بعض افراد کے ساتھ ایسا کیا کہ انہوں نے ایک مجلس میں تین طلاق دیا تو خلیفہ دوم نے ان کے طلاق کو واقع کر کے شوہر اور بیوی کے درمیان تفریق کرادی۔ مگر اسی کے ساتھ اُنہوں نے یہ بھی کیا کہ شوہر کی پیٹھ پر کوڑے مار کر اس کو زخمی کر دیا (ثم اوجع ظهره)۔

خلیفہ دوم کا یہ عمل کوئی منصوص حکم نہ تھا بلکہ وہ ایک انتظامی حکم (executive order) تھا۔ یعنی اس کی حیثیت یہ تھی کہ حاکم وقت نے اپنے اختیار کے مطابق، مرد کو ایک تنبیہی سزا دی۔ اس سزا کا مقصد یہ تھا کہ ایک مجلس میں تین طلاق کی سخت حوصلہ شکنی کی جائے۔ چنانچہ عملاً یہی ہوا۔ لوگوں نے سزا کے

خوف سے ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا طریقہ چھوڑ دیا۔

موجودہ زمانہ میں، خاص طور پر برصغیر ہند میں، یہ طریقہ دوبارہ پھیل گیا ہے۔ لوگ غصہ میں آتے ہی فوراً طلاق طلاق طلاق کہہ دیتے ہیں۔ وہ ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے دیتے ہیں جو شرعی قانون کا غلط استعمال ہے اور وہ شوہر کے لیے سخت گناہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ صورت بہت عام ہوگئی ہے اور ضروری ہوگیا ہے کہ اس معاملہ میں شریعت کا واضح حکم متعین کیا جائے۔

راقم الحروف کے نزدیک موجودہ حالت میں اس معاملہ میں ہمارے لیے دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب ہے۔ ایک یہ کہ جب ایک شخص فوری جذبہ کے تحت طلاق طلاق طلاق کہہ دے تو اس کو شوہر کی طرف سے غصہ پر محمول کیا جائے۔ یعنی یہ سمجھا جائے کہ شوہر نے شدت اظہار کے طور پر اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاق دے دی۔ حالاں کہ اس کا مقصد تکمیلی طلاق دینا نہ تھا بلکہ صرف طلاق دینے کے ارادے کا شدید انداز میں اظہار کرنا تھا، یہ تہدید وتشدید کا معاملہ تھا، نہ کہ حقیقتاً تطلیق ثلاثہ کا معاملہ۔

اس صورت میں یہ کیا جائے گا کہ شوہر سے یہ کہا جائے گا کہ تمہاری تین طلاق عملاً پہلے مہینہ کی ایک طلاق قرار دی جاتی ہے۔ اب تم کو یہ اختیار ہے کہ چاہے تو رجوع کرلو اور اگر تم تفریق کے ارادہ پر قائم ہو تو قرآنی طریقہ کے مطابق، اگلے مہینہ تم دوسرا طلاق دو۔ اور اگر اس کے بعد بھی تفریق کا ارادہ باقی رہے تو تیسرے مہینہ تم طلاق کے عمل کی تکمیل کر کے اپنی بیوی سے علیٰحدگی اختیار کر سکتے ہو۔

اس معاملہ میں دوسرا ممکن طریقہ ہمارے لیے یہ ہے کہ ہم سنت فاروقی کو اپنے زمانہ کے لحاظ سے اختیار کریں۔ یعنی ایک مجلس کی تین طلاق کو تین طلاق قرار دے کر عورت اور مرد کے درمیان تفریق کرا دیں۔ مگر اس صورت میں لازمی طور پر ہمیں سنت فاروقی کے مطابق یہ کرنا ہوگا کہ اس مزاج کی حوصلہ شکنی کے لیے شوہر کو سخت سزا دیں۔

موجودہ قانونی نظام کے تحت غالباً یہ ممکن نہیں کہ ایسے شوہر کو کوڑا مارنے کی سزا دی جائے۔ مگر

اس کا ایک بدل یقینی طور پر ممکن ہے۔ اور وہ یہ کہ علمائے ہند نے جس طرح شاہ بانو بیگم کے مشہور کیس میں حکومتِ ہند سے مطالبہ کر کے پارلیمنٹ سے ایک قانون بنوایا تھا اسی طرح اس معاملہ میں بھی حکومت سے مطالبہ کر کے ہندستانی پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور کرایا جائے۔ اس قانون میں یہ طے کیا جائے کہ جو مسلمان ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے گا تو اس کی طلاق تو واقع کر دی جائے گی مگر اسی کے ساتھ شوہر کو اپنے اس غیر شرعی فعل کی سخت سزا بھی بھگتنی ہوگی۔

راقم الحروف کے نزدیک وہ سزا یہ ہونی چاہیے کہ جس شوہر نے ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا غیر شرعی فعل کیا ہے اس سے جرمانہ کے طور پر بھاری رقم وصول کی جائے اور یہ پوری رقم مطلقہ عورت کو دے دی جائے۔ بالفرض اگر یہ شوہر نقد رقم دینے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اس کو طویل مدت کے لیے قید بامشقت (rigorous imprisonment) کی سزا دی جائے۔ اس معاملہ میں مانع جرم سزا (deterrent punishment) ضروری ہے۔ اس سے کم کوئی سزا اس معاملہ میں مفید نہیں ہو سکتی۔

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ ایڈیشن کا نام دی اسپریچول میسیج (The Spiritual Message) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

دی اسپریچول میسیج، فی کاپی -/15 روپے، سالانہ -/165 روپے۔

خط و کتابت کا پتہ ہے:

The Spiritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 2834 1654/ 28346079/ 2821 8609, Fax: 2823 6323
Email: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in

ایک خط

برادر محترم جسٹس ایم ایم قاضی　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۰ دسمبر ۲۰۰۴ کی شام کو آپ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ آپ نے مسلمانوں کی حالت کے بارے میں اپنی دردمندی کا ذکر کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ اقبال موجودہ مسلمانوں کے بارے میں پہلے بہت خوش فہم تھے، انہوں نے لکھا:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مگر بعد کو اقبال نے موجودہ مسلمانوں کے بارے میں یہ شعر تحریر کیا:

تیرے محیط میں کہیں جوہر زندگی نہیں　　ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

اصل یہ ہے کہ موجودہ مسلمان فطرت کے قانون کے مطابق اپنے دور زوال میں ہیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص یا گروہ کے اسلام کا آغاز حق کی معرفت (المائدہ ۸۳) سے ہوتا ہے۔ پھر بعد کی نسلوں میں اس کا زوال (degeneration) شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ حالت آجاتی ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فطال علیهم الأمد فقست قلوبهم (الحدید ۱۶) یعنی لمبی مدت گزرنے پر بعد کی نسلوں میں قساوت پیدا ہو جانا۔ یہ قساوت کیا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو یہود کی زبان سے دوسرے مقام پر غلف (البقرۃ ۸۸) کہا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہے:

And they say: Our heart are covered

عقل پر غلاف ہونا کیا ہے۔ یہ دوسرے لفظوں میں ذہنی جمود (intellectual stagnation) کا معاملہ ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو وہ حالت پیدا ہوتی ہے جس کو انگریزی میں کنڈیشننگ (conditioning) کہا جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: کل مولود یولد علی الفطرة فابواه

یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ (ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں)۔

اس حدیث میں یہودی یا مسیحی یا مجوسی کا لفظ حصر کے معنٰی میں نہیں ہے بلکہ وہ علامتی معنٰی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ خدائی فطرت پر ہوتا ہے۔ مگر اس کا گھر، اس کا ماحول، اس کا معاشرہ، اس کے ادارے، اس کے ذہن کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن کے اوپر پیاز کی طرح پردے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ وہ بے آمیز انداز میں یا فطرت ربانی کے انداز میں سوچ سکے۔ اس طرح ہر انسان کنڈیشننگ کا ایک کیس ہے۔ جب تک اس کنڈیشننگ کو ختم نہ کیا جائے اس وقت تک وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھ سکے۔

تصحیح ذہن کے اس عمل کو ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کہا جا سکتا ہے۔ یہ ڈی کنڈیشننگ ہر انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ غالباً اسی ڈی کنڈیشننگ کے عمل کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ: ان اللہ یبعث علی رأس کل مائة سنة من یجدد لھا دینھا (اللہ ہر سو سال کے سرے پر امت میں ایک شخص کو بھیجے گا جو اس کے لیے اس کے دین کی تجدید کرے گا)۔ میرے نزدیک یہاں تجدید سے مراد ابتدائی طور پر یہی ڈی کنڈیشننگ ہے۔ یعنی ہر اگلی نسل میں جب کہ لوگوں کے ذہن میں کنڈیشننگ کا مسئلہ پیدا ہوگا اور اس کی وجہ سے دین فطرت اُن کے لیے اجنبی بن جائے گا تو اس وقت خدا ایسے مجدد پیدا کرے گا جو لوگوں کے ذہن سے مصنوعی پردے ہٹائے اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ دین کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھ سکیں۔

پچھلے سو سال کے درمیان مسلمانوں میں بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے خیال کے مطابق، مسلم ملت کے احیاء نو کا کام کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ ساری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ان لوگوں نے اپنا کام اس مفروضہ کے تحت شروع کیا کہ مسلم ملت بالفعل موجود ہے اور اب ان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اس ملت کو جوش دلا کر اس کو اقدام پر آمادہ کریں۔

اسی بات کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے:

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی　　حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

مگر یہ مفروضہ بجائے خود درست نہ تھا۔ ان رہنماؤں کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ مسلم ملّت کے افراد کی ڈی کنڈیشننگ کر کے اس کے اندر اسلام کی معرفت پیدا کریں۔ وہ اسلام کو ان کے لیے ری ڈسکوری (rediscovery) بنادیں۔

مثال کے طور پر انہوں نے کلمہ پڑھنے کو کافی سمجھا۔ حالاں کہ اصل ضرورت یہ تھی کہ وہ ہر شخص کے اندر کلمہ کا شعور پیدا کریں، وہ قائل کلمہ کو عارف کلمہ بنادیں۔ اسی طرح انہوں نے دشمنی کے حوالہ سے مسلمانوں کو ابھار کر انہیں دشمن کے خلاف جہاد کے لیے کھڑا کیا۔ حالاں کہ قرآن کے مطابق، جہاد (بمعنی قتال) کا تعلق دشمنی سے نہیں ہے بلکہ حملہ کے وقت دفاع سے ہے۔ انہوں نے فضیلت نماز کی کہانیاں سنا کر مسجدوں کو مسلمانوں سے بھر دیا۔ حالاں کہ پہلا کام یہ تھا کہ لوگوں کے اندر نماز کی اسپرٹ پیدا کی جائے جس کو قرآن میں خشوع کہا گیا ہے۔

اسی طرح انہوں نے اتحاد کے نام پر بڑے بڑے جلسے کر کے یہ سمجھا کہ وہ ملت کے اندر اتحاد پیدا کر رہے ہیں۔ حالاں کہ اتحاد کا راز شعور اتحاد ہے، یعنی لوگوں کے اندر یہ ذہن پیدا کرنا کہ وہ اختلاف کے باوجود اتحاد کے ساتھ رہ سکیں۔ انہوں نے فضائل قرآن کے نام پر لوگوں کو قرآن کی تلاوت کرنے والا بنایا۔ حالاں کہ پہلا کام یہ تھا کہ لوگوں کے اندر قرآن کی نسبت سے تدبر کا مزاج پیدا کیا جائے۔ انہوں نے اسٹیٹ کو اسلامائز کرنے کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں اُٹھائیں۔ حالاں کہ اصل کام یہ تھا کہ افراد کو اسلامائز کرنے کی کوشش کی جائے، وغیرہ۔

موجودہ زمانہ میں ہر رہنما مسلمانوں کے زوال کی شکایت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر لوگوں کو نہ تو یہ پتہ ہے کہ زوال کا حقیقی سبب کیا ہے اور نہ ان کو یہ معلوم ہے کہ اس زوال کو ختم کرنے کا نقطۂ آغاز کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا نقطۂ آغاز ذہن سازی ہے، نہ کہ عملی اقدام۔ اور ذہن سازی کا کام فرد کے ذہن کو ایڈریس کرنے سے ہوتا ہے، بھیڑ کو ایڈریس کرنے سے اس کام کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ یہ شکایت کررہے ہیں کہ غیر مسلم قومیں ان کے اوپر ظلم کررہی ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنی زیادتی کا نشانہ بنارہی ہیں۔ ان کے نزدیک موجودہ مسلمان ان غیر مسلم طاقتوں کی سازش میں گھر گئے ہیں۔ ان باتوں کے نتیجہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمان اس ذہنیت کا شکار ہوگئے ہیں جس کو محصور ذہنیت (besieged mentality) کہا جاتا ہے۔ مگر میں اس سوچ کو خلاف واقعہ سمجھتا ہوں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم قوموں کے مقابلہ میں حفاظت کا معاملہ تمام تر دعوت پر منحصر ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، عصمت من الناس کا راز تبلیغ ما أنزل اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان غیر مسلم قوموں کی طرف سے جس مغلوبیت کا شکار ہیں اس سے نکلنے کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسلمان غیر مسلم قوموں کے اوپر دعوت الی اللہ کا فرض انجام دیں۔ یہ غیر مسلم قومیں مسلمانوں کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور مدعو گروہ کے مقابلہ میں صرف ایک چیز مطلوب ہے، اور وہ پرامن دعوت ہے۔ یہ معاملہ قرآن میں حضرت یونس کی مثال سے واضح ہوتا ہے۔ قرآن میں رسول کو مخاطب کرتے ہوئے امت محمدی سے کہا گیا ہے کہ: ولا تکن کصاحب الحوت (القلم ۴۸) یعنی تم مچھلی والے کی مانند نہ بننا ورنہ تمہارا حال بھی وہی ہوگا جو مچھلی والے (یونس) کا ہوا۔

مچھلی والے سے مراد حضرت یونس ہیں۔ ان کو خدا کا پیغام دینے کے لیے عراق کے قدیم شہر نینویٰ بھیجا گیا۔ انہوں نے وہاں کے لوگوں کو خدا کی طرف بلایا مگر ان کی طرف سے جلد مثبت ردعمل نہ ملنے کی وجہ سے وہ، قرآن کے الفاظ میں، ان سے غصہ ہوگئے اور ان کو چھوڑ کر نینویٰ سے باہر چلے گئے۔ خدا کو ان کی یہ روش پسند نہ آئی اور خدا کے حکم سے وہ ایک بڑی مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے جس کو قرآن میں ظلمات (الانبیاء ۸۷) کہا گیا ہے۔ یعنی شدید تاریکی۔

قرآن کے مطابق، حضرت یونس اس تاریکی کے اندر سے صرف اس وقت باہر آئے جب کہ انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اس کے لیے تیار ہوئے کہ وہ دوبارہ اپنی مدعو قوم کی طرف جائیں اور انہیں خدا کا پیغام پوری طرح پہنچائیں۔ ابتدائی طور پر قرآن میں اس معاملہ کو ایک فرد

(حضرت یونس) کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کو عام کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وکذلك ننجی المؤمنین (الانبیاء ۸۸)

اس عموم سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہی معاملہ تمام اہل ایمان کا ہے۔ تمام اہل ایمان کا یہی حکم ہے کہ اگر وہ اپنی دعوتی زندگی کو چھوڑ دیں تو اس کے بعد وہ مسائل کی اندھیری دنیا میں ڈال دئے جائیں گے۔ مسائل ومصائب کی اس اندھیری دنیا سے نکلنا ان کے لیے صرف اس وقت ممکن ہوگا جب کہ وہ ترک دعوت کے معاملہ میں اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کریں اور اپنی روش کو بدل کر دوبارہ دعوت کے میدان میں سرگرم ہو جائیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا کیس یہی ہے۔ وہ موجودہ زمانہ کی غیر مسلم قوموں سے ''غصہ'' ہو گئے اور ان کے خلاف نفرت اور تشدد کی مہم چلانے لگے۔ یہ خدا کی سنت کے خلاف تھا۔ چنانچہ وہ مسائل ومصائب کے اندھیرے میں ڈال دئے گئے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بڑی تعداد میں سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر یہ تمام سرگرمیاں کمیونٹی ورک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی سرگرمی دعوہ ورک نہیں۔ کچھ لوگ دعوت کے نام پر تقریر وتحریر کے ذریعہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے قومی مناظرہ ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔

خلاصہ یہ کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دوبارہ زندگی دینے کے لیے دو نکاتی فارمولا یہ ہے — (۱) ان کے ساتھ وہ عمل کیا جائے جس کو قرآن میں یا ایھا الذین آمنوا آمِنوا (آل عمران ۱۳۶) کہا گیا ہے۔ یعنی اے وہ لوگو جو کلمہ پڑھ کر مومن ہوئے ہو، شعوری دریافت کی سطح پر مومن بنو۔ (۲) یہ کہ مسلمان حقیقی معنٰی میں داعی بنیں اور دوسری قوموں کے ساتھ مدعو فرینڈلی تعلق قائم کریں۔ وہ مدعو قوموں کے خلاف نفرت اور تشدد کی تمام سرگرمیاں مکمل طور پر ختم کر دیں۔

احیائے ملت کی یہی دو شرطیں ہیں۔ ان دو شرطوں کو چھوڑ کر دوسری کوئی بھی سرگرمی مسلمانوں کو نئی زندگی دینے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

نئی دہلی، ۱۳ دسمبر ۲۰۰۴ — دعا گو — وحید الدین

۱۔ بی بی سی لندن کے نمائندہ مسٹر داؤد اعظمی افغانی نے ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ کو ریکارڈ کیا گیا۔ روس نے ۲۵ دسمبر ۱۹۷۹ کو افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کر دی تھیں۔ اس کے بعد روسی فوجوں اور افغانی مجاہدین کے درمیان لمبی لڑائی ہوئی۔ آخر کار روسی فوج کو واپس جانا پڑا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اسی مسئلہ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ روس کے خلاف افغانیوں کی جنگ ایک قومی جنگ تھی، وہ اسلامی جہاد نہ تھا۔ اسی طرح طالبان نے افغانستان میں جو اسلامی حکومت قائم کی وہ بھی اسلامی حکومت نہ تھی بلکہ ایک قسم کی قبائلی حکومت تھی۔ افغانیوں کی اصل کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی سیاسی نظام کی ماتحتی قبول نہیں کرتے۔ اس وجہ سے وہ بار بار خود اپنے حکمرانوں سے لڑتے رہے ہیں۔ اسی مزاج کی بنا پر افغانی سردار آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ افغانی قوم اپنے روایتی مزاج کے اعتبار سے ایک جنگجو قوم ہے۔ روس کے خلاف یا امریکا کے خلاف افغانیوں کی جنگ اسی جنگ جوئی کے مزاج کا نتیجہ تھی، وہ اسلامی اسپرٹ کا نتیجہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لمبی لڑائیوں کے باوجود افغانستان کو اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں ملا۔ افغانیوں کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ انہیں تعلیم یافتہ بنایا جائے۔

۲۔ پربھات پرکاشن (نئی دہلی) کے زیر اہتمام جے پور میں ۱۸۔۱۹ دسمبر ۲۰۰۴ کو ایک عوامی پروگرام ہوا جس میں ہندو۔ مسلمان دونوں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اس کی رپورٹ سفرنامہ کے تحت ماہنامہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۳۔ اخبار سہارا سمے (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر سنیل کمار نے ۲۰ دسمبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس میں ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک کے دور میں مسلم مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ ۱۹۴۷ کے بعد کچھ دنوں تک مسلمانوں کے درمیان تعطل کی فضا تھی۔ اب پچھلے برسوں سے مسلمان کافی بیدار ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر حقیقت پسندانہ سوچ آئی ہے۔ اب وہ ہر شعبہ میں تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔

۴۔ ہمدرد یونیورسٹی (نئی دہلی) کے بورڈ روم میں ۲۱ دسمبر ۲۰۰۴ کو ایک اجتماع ہوا جس میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور پروفیسر حضرات شریک ہوئے۔ پروگرام کے مطابق، امریکا کے ایک سینئر پروفیسر تھیوڈور رائٹ (Theodore P. Wright) کا یہ مقالہ ویسٹ ایشیا میں امریکی پالیسی سے متعلق تھا۔ اس کا ٹائٹل یہ تھا:

U.S. Intervention in South Asia and the Middle East

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں ایک سوال یہ اٹھایا گیا کہ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان جو مسئلہ ہے اس کا حل کیا ہے۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ اس کا حل قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ اس کے مطابق، اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ پرتشدد طریق کار کو چھوڑ کر پرامن طریق کار کو اختیار

کیا جائے اور صلح کے اصول کو اپنایا جائے۔ اس پر حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ یہ مسئلہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ قرآن کا سادہ فارمولا اس کے حل کے لیے کافی نہیں۔ اس سوال کا تفصیل سے جواب دیا گیا۔

۵۔ ای ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۲۵ دسمبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق مجوزہ ماڈل نکاح نامہ کے مسئلہ سے تھا۔ جواب میں بتایا گیا کہ موجودہ حالت میں یہ ایک بے فائدہ کام ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی ماڈل نکاح نامہ موجودہ حالت میں عملاً چلنے والا نہیں۔ اس قسم کا ماڈل نکاح نامہ دو صورت میں چل سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کے پیچھے سیاسی اقتدار کی طاقت ہو۔ ظاہر ہے کہ یہاں وہ موجود نہیں۔ دوسری چیز ہے، سماجی آمادگی۔ اس وقت مسلم سماج اتنی زیادہ انتشار کی حالت میں ہے کہ وہ کسی ماڈل نکاح نامہ کو عمومی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔ ایسی حالت میں کرنے والوں کو وہ کام کرنا چاہیے جو نتیجہ خیز ہو۔ مثلاً مسلم سماج کے اندر شعوری بیداری لانا۔

۶۔ جین ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق ماڈل نکاح نامہ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اس قسم کا ماڈل نکاح نامہ صرف ایک کاغذی کارروائی ہے، وہ کبھی عمل میں آنے والا نہیں۔ عمل میں آنے کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کی پشت پر سیاسی طاقت ہو جو کہ اس وقت موجود نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مسلم معاشرہ رضا کارانہ طور پر اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔ اور یہ دوسری شرط بھی اس وقت معاشرہ کے اندر نہیں پائی جاتی۔ ایسی حالت میں یہ ہوگا کہ ماڈل نکاح نامہ عملاً رائج تو نہ ہوگا۔ البتہ بے فائدہ قسم کی اختلافی بحثوں کا ایک نیا دروازہ کھل جائے گا۔

۷۔ اسلامی مرکز کے تحت ہونے والے ہفتہ وار کلاس (۳۱ دسمبر ۲۰۰۴) میں دوسرے حضرات کے علاوہ پروفیسر عبداللہ احمد النعیم شریک ہوئے۔ وہ سوڈان میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب وہ امریکا کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ اُن کی خواہش کے مطابق، اس موقع پر اسلام اور سیاست کو موضوع بنایا گیا۔ صدر اسلامی مرکز نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ اسلام میں سیاست کا درجہ کیا ہے۔ پروفیسر موصوف پوری طرح مطمئن ہوئے۔ گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کا نشانہ اسلامائزیشن آف مَین ہے نہ کہ اسلامائزیشن آف اسٹیٹ۔ اُنہوں نے اس سے پورا اتفاق کیا۔ پروفیسر موصوف کو کئی عربی اور انگریزی کتابیں ہدیہ میں دی گئیں۔

۸۔ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے کیرلا (کوچن) کا سفر ہوا۔ یہ پروگرام جنوری ۲۰۰۵ کے پہلے ہفتہ میں تھا۔ اس کا موضوع تھا۔ امن اور روحانیت۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں سفر نامہ کے تحت شائع کردی جائے گی۔

۹۔ چند نئی کتابیں زیر طبع ہیں — حکمتِ اسلام، نشان منزل، وغیرہ۔ چھپ کر تیار ہونے کی اطلاع بعد کو دی جائے گی۔

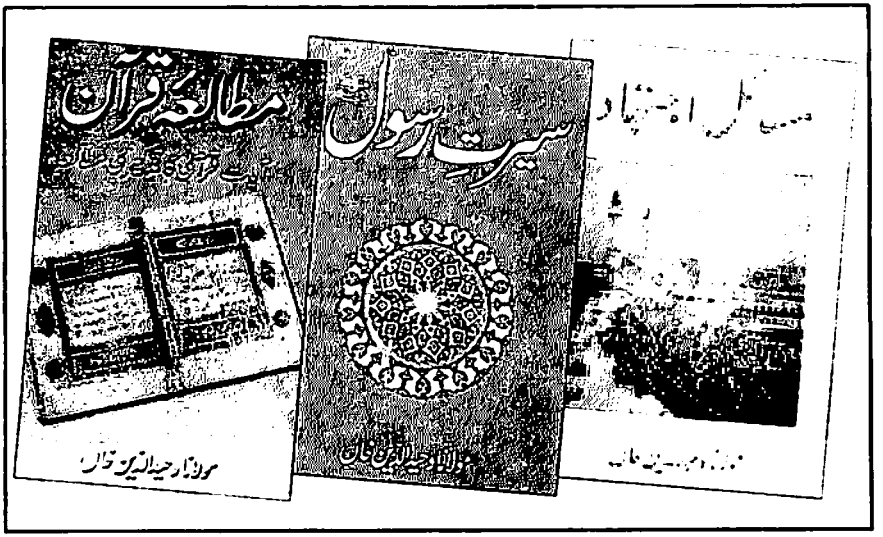
مطالعۂ قرآن
سیرت رسول
مولانا وحید الدین خاں

مذہب اور سائنس
مولانا وحید الدین خاں

ڈائری
۱۹۹۲-۱۹۹۱

تعمیر انسانیت
انسانیت کی تعمیر میں اسلام کا حصہ
مولانا وحید الدین خاں

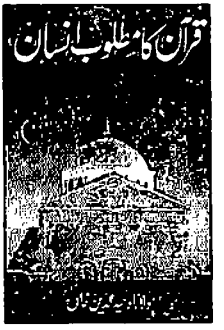
قرآن کا مطلوب انسان
مولانا وحید الدین خاں

اسفارِ ہند

نشری تقریریں

اسلام دین فطرت
مولانا وحید الدین خاں

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$20/£10	$10/£5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$35/£18	$18.£8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$50/£25	$25/£12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$80/£40	$40/£18

Goodword Books Pvt. Ltd.

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013

Tel. (9111) 2435 6666, 2435 5454, Fax (9111) 2435 7333, e-mail: info@goodwordbooks.com

ORDER FORM (URDU BOOKS)

QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES
	60.00	مضامین اسلام		12.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)		400.00	تذکیر القرآن (مکمل مجلد)
	10.00	باغ جنت		80.00	ڈائری (جلد اول)		250.00	تذکیر القرآن (پیپر بیک)
	10.00	نار جہنم		65.00	کتاب زندگی		85.00	اسباق تاریخ
	10.00	سچا راستہ		25.00	اقوال حکمت		60.00	تعمیر حیات
	10.00	دینی تعلیم		10.00	تعمیر کی طرف		50.00	تعمیر انسانیت
	10.00	خلیج ڈائری		20.00	تبلیغی تحریک		125.00	سفرنامہ غیرملکی اسفار جلد اول
	10.00	رہنمائے حیات		25.00	تجدید دین		125.00	سفرنامہ غیرملکی اسفار، جلد دوم
	10.00	تعدد ازدواج		35.00	عقلیات اسلام		80.00	اسلام: ایک تعارف
	60.00	ہندستانی مسلمان		25.00	قرآن کا مطلوب انسان		60.00	اللہ اکبر
	10.00	روشن مستقبل		10.00	دین کیا ہے؟		50.00	پیغمبر انقلاب
	10.00	صوم رمضان		20.00	اسلام دین فطرت		65.00	مذہب اور جدید چیلنج
	8.00	اسلام کا تعارف		10.00	تعمیر ملت		35.00	عظمت قرآن
	20.00	علما اور دور جدید		10.00	تاریخ کا سبق		60.00	عظمت اسلام
	60.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین		8.00	فسادات کا مسئلہ		10.00	عظمت صحابہ
	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کرچکی ہے		8.00	انسان اپنے آپ کو پہچان		80.00	دین کامل
	10.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ		8.00	تعارف اسلام		45.00	الاسلام
	10.00	یکساں سول کوڈ		8.00	اسلام پندرہویں صدی میں		50.00	ظہور اسلام
	10.00	اسلام کیا ہے؟		12.00	راہیں بند نہیں		40.00	اسلامی زندگی
	40.00	میوات کا سفر		10.00	ایمانی طاقت		35.00	احیاء اسلام
	35.00	قیادت نامہ		10.00	اتحاد ملت		65.00	راز حیات
	8.00	منزل کی طرف		20.00	سبق آموز واقعات		40.00	صراط مستقیم
	125.00	اسفار ہند		10.00	زلزلۂ قیامت		60.00	خاتون اسلام
	100.00	ڈائری ۹۰۔۱۹۸۹		12.00	حقیقت کی تلاش		50.00	سوشلزم اور اسلام
	70.00	قال اللہ وقال الرسول		8.00	پیغمبر اسلام		30.00	اسلام اور عصر حاضر
	90.00	ڈائری ۹۲۔۱۹۹۱		10.00	آخری سفر		40.00	الربانیۃ
	80.00	مطالعہ قرآن		10.00	اسلامی دعوت		45.00	کاروان ملت
	40.00	مذہب اور سائنس		20.00	حل یہاں ہے		30.00	حقیقت حج
	100.00	دین و شریعت		25.00	امہات المومنین		35.00	اسلامی تعلیمات
	60.00	مطالعۂ سیرت		85.00	تصویر ملت		25.00	اسلام دور جدید کا خالق
	10.00	خدا اور انسان		50.00	دعوت اسلام		40.00	حدیث رسول
	8.00	ہندستان آزادی کے بعد		40.00	دعوت حق		35.00	راہ عمل
	100.00	مسائل اجتہاد		80.00	نشری تقریریں		80.00	تعبیر کی غلطی
	120.00	مطالعۂ حدیث		60.00	دین انسانیت		25.00	دین کی سیاسی تعبیر
	100.00	امن عالم		50.00	فکر اسلامی		10.00	عظمت مومن
	100.00	عورت: معمار انسانیت		50.00	شتم رسول کا مسئلہ		8.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد
				8.00	طلاق اسلام میں		8.00	تاریخ دعوت حق

RNI 28822/76 • U(SE) 12/2003-05
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2003-05